

غالب فکرو فن

رشید حسن خان





PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO : +92 307 2128068 - +92 308 3502081



غالب فکرو فن



مؤلف
رشید حسن خان



غالب اکیڈمی کراچی





۶۱۹۸۷

اشاعت

تیس روپے

قیمت

فہرست

۹	ڈاکٹر طاہر انصاری	نشاط کا شاعر
۲۴	پروفیسر میر حسن عابدی	غالب اور سبک بندی
۷۲	ڈاکٹر عابد پشاور	غالب، حالی، شفیقہ اور ہم
۹۲	کاظم علی خان	بیخ تیز پر ایک نظر
۱۰۴	ڈاکٹر شریف حسین قاسمی	غالب اور تذکرہ آفتاب عالم تاب



انتساب

ڈاکٹر نور الحسن انصاری
شاہد ماہی

پیشہ ورانہ
سیر حیات



نشاط کا شاعر

ابنِ علم و خبر کے اس مجمع میں جو بات مجھے بتانی ہے وہ نہ کوئی انکشاف ہے، نہ انحراف۔ پچھلے ۸۰ برس میں اشارتاً یا ضمناً کئی بار کہی جا چکی ہے، البتہ اسے اونچی آواز میں یا کافی زور دے کر نہیں کہا گیا اور آج غالب شناسی کے علاوہ خود وقت کا تقاضا ہے کہ اسے باصرار کہا جائے۔

یوں تو اسے بتانے کے لیے کافی ہے اور میری بکھٹ کا مزاج بھی یہی ہے کہ صرف ایک پیرا گراف میں سمیٹ دیا جائے؛ سو عرض ہے کہ :

غالب محض ایک فکری شاعر نہیں، زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھیج گوارا اور ناگوار مظاہر میں وہ ایک زندہ و توانا وجود کا مردانہ برتاؤ، ایک سوچا سمجھا DIALECTICAL APPROACH اور اپنے ارد گرد کے ساتھ ایک نیا تامل ATTITUDE بھی ہے۔ یہ برتاؤ یا آپرویچ حیثیت و حسرت کی ککک رکھنے کے باوجود ماضی کی فوری خوانی اور حال پر چاک دامانی سے نہ شروع ہوتا ہے، نہ اس پر تمام ہوتا ہے۔ اس کے ہاں تاسف اور انفعالی کی کیفیت طاری نہیں، بلکہ شگفتگی اور سرشاری کی،

زندگی کے آلام سے رستہ کشی، فُتال زندگی بسر کرنے کی اور رنج و رست کی ہر موج کے منتقم سے اہرت کی بوندیں پکالینے کی ہمت پائی، مہاتی ہے، وہ نشاط طلب ہے، اشک طلب نہیں۔ خیال و عمل کی یہ دو چند مخصوص الفاظ (مثلاً "نشاط" "تغہائے قلم" "نشاطِ غم" "تمنا" "تبرق" "سوج" "پرواز" "تپے تابنی" "شکاکش" "شوق" "جوش" "عجبون" "رفتار" "چراغ" "پیش" "رقص" "اور ان کے ساتھ کی ترکیب کے دہرائے جانے سے ہی ظاہر نہیں ہوتی، بلکہ اس میں ایک اوٹ تسلسل ہے؛ پہلو بدل بدل کر، قریب و دور کے مختلف زاویوں اور گوشوں سے اس ذہنی کیفیت کو، جو نشاط کے جلکے اور گہرے رنگوں پر حاوی ہے، یوں اُجاگر کیا گیا ہے کہ پچاس پچپن برس کی مشق سخن میں وہ سبکے حاوی رحمان نظر آتی ہے۔ ایک ہی فضا کی کئی اردو فارسی غزلوں میں جو مختلف وقتوں میں لکھی گئیں، نشاط کے مختلف عناصر کا ابھرنامعنی اتفاق نہیں ہو سکتا غالب کی اہم مشنریوں اور خطوں سے، خطوط کے لب و لہجے سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس نکتے کی از سر نو دریافت غالب سے ہمارے اس رشتے کو اور مضبوط کرنے والی ہے جو نسل حاضر سے اسے جوڑتا ہے اور غالب کے اپنے زمانے میں گم شدہ رہ گیا تھا۔

بات تمام ہوئی، اب اس پر چند سوال قائم ہوتے ہیں :

۱ کیا غالب کے کلام میں اور خطوں میں رونا پیشنا کچھ کم ہے؟ کیا اپنی اور دوسروں کی بہتاسانے میں وہ کسی سے پیچھے ہیں؟ کیا غم اور اس کے ساتھ کی ترکیب اور متعلقہ *anandmiser* کی نظر و غریں جا بجا بکھری ہوئی نہیں ہیں؟

۲ کیا غالب کے جیسے زمانے اور حالات کے فن کار کی اُدا سی یا

انفرادی کوئی اُن ہونی یا بری بات ہے ؟

۳ ”نشاط“ سے دراصل ہماری کیا مراد ہے ؟ کیا ہم اس سے وہی مفہوم نکالتے ہیں جو غالب کے غزلوں سے ظاہر ہوتا ہے، یا کوئی اور وسیع معانی جنہیں حسبِ مناسبت پر پھیلا یا جلا سکے ؟

یہ اور اسی قسم کے دوسرے سوال وضاحت کی راہ ہم پر آسان کرتے ہیں : غالب کے ہاں رفتہ رفتہ مسئلے کا یہ رُخ ابھرتا ہے کہ نشاط اور غم دو متضاد جذبے یا کیفیتیں نہیں ہیں، دونوں سے جدا جدا یا بر یک وقت لذت پانا ممکن ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ زندگی کی محرومیوں کو ذاتی غم بنالینے کے بجائے سوچ نشاط میں ڈبوئیے سے ذہنی افق وسیع ہوتا ہے اور انسانی روح شاداب رہتی ہے۔ غم انسان کو بھاتا نہیں، بلکہ اس کے ارراک اور خرد کو مہقل کرتا ہے، اسے تاثر (HUMAN RESPONSE) کی اصطلاح پر لے جاتا ہے۔ غم اور ذاتی غم کی بھٹی سے گزرنے پر ہی آدمِ خاکی نشاط کی اس روحانی کیفیت کا اہل بناتا ہے جو ”صحیح و سستی اور رنج و راحت کو ہموار“ کر لے۔ یہ الفاظ اگرچہ غالب نے عزیز شاہرد ہر گوپال تفتہ کو عمر کے آخری دور میں نصیحت کئے تھے لیکن اس خیال کے ابتدائی انقوش ان کے بیس اکیس برس کے کلام میں بھی موجود ہیں :

فتادگی میں قدم استوار رکھتے ہیں

برنگِ بادہ سر کوے یار رکھتے ہیں

یہاں ”قدم“ اور ”سر“ کی نسبت اہم نہیں، ”قدم استوار“ اور ”سر کوے یار“ کی نسبت اپنے کسی آئندہ کی جانب بڑھتے جانا۔۔۔۔۔ وہ بھی فتادگی یا بے بسی کے حالات میں ! یہ اہم ہے۔

اسی غزل میں، جو ابتدائی کلام کے چند نمونوں میں سے ہے :

ظلم سستی دل، نسوے ہجومِ سرشک ہم ایک میکہ دہا کے پار رکھتے ہیں

صدیوں سے مشرق کا چلن رہا ہے کہ شہر کے مجموعے سے باہر عموماً دریا کنارے یا دریا کے پار غلوت گزرنی یا غلوت آرائی کا سائنس کا سامان رکھا جائے۔ غالب اسی سمیت کے نوجوان تھے اور وہیں کے مشاہدے سے انھوں نے یہ نکتہ پیدا کیا کہ آنسوؤں کو زندہ بننے کے بجائے، بہا دینے کے بعد، یعنی اس دریا کو پار کر کے ”مستی دل“ کا طلسم کھتا ہے۔
نوح تازگی پاتی ہے۔

آگے چل کر انھوں نے غم اور نشاط کی نسبت کو ایک ایک پہلو سے روشن کیا ہے :

غم لذتِ خاص کہ طالبِ بذوقِ آں
پنہاں نشاطِ دُرُودِ پیداشودِ ہلاک

غم تو ہر ذی روح کو ہوتا ہی ہے لیکن غالب میں غم کے قائل ہیں، وہ ایسی لذت ہے کہ اس کا شناسا یہ ظاہر آفت زدہ رہے، لیکن اندر سے نشاط پاتا ہے۔ ان کے اردو اور فارسی کلام میں اگرچہ نشاط کا لفظ تقریباً بچا پس ہوا ہے لیکن جو وسیع اور گہرا مفہوم غالب نے اس لفظ کے دامن میں رکھا تھا، وہ عمر اور فن کے مختلف مرحلوں میں جگہ جگہ ٹھکتا جاتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ مختلف مرحلوں میں اس راگ کے سہم تال بدلتے گئے ہیں۔ اولیوں ”سرخوشی و سرمستی“ پھر آزادگی و بے نیازی، پھر غم، غمزدہ اور آرٹ کے شلت میں نشاط کی کیفیت کا اعلان جو لذتِ زخم یا لذتِ آزار بن گئی ہے۔ اور بالآخر یہ کہ جتنی اور ہمیشہ زبانی راحت ملے اسے قیمت جانا، فریاد کو گتے میں ڈھالنا۔ نشاط کا یہ آخری مرحلہ ہے جو عمر بھر کی شکن کو گوارا بنانے کی سکت رکھتا ہے۔ نشاط کے سرگرم میں یہ سہم، پنجم کا تناسب، دہیت — وقت اور پھر دلہنت کا اتار چڑھاؤ خود غالب نے ہم پر کھولا ہے۔

نشاط —۔ اول ایک تنہا ہے، قدرتی تنہا عشرت و راحت کی :

ہامِ بر فردہ ہے سرشارِ تنہا مجھ سے کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھ سے

تماشاے گلشن، تماشائے چیدن

بہار آفرینا، گنہگار ہیں ہم

(فرا "بہار آفرینا" کا مترجم)

ہوں گرمی نشاۃ ثعلویٰ سے غمناک

میں منسوب گلشن نا آفرینا ہوں

پھر ایک طرز کے شعر ملتے ہیں، نشاۃ کی لے میں فرق آتا ہے:

ہمیں کو ہے نشاۃ کار کیا کیا

نہ ہو مزا تو بیچنے کا مزا کیا

ضمناً میر کی ایک غیر معمولی قول کا غیر معمولی شریار آتا ہے:

لذت سے نہیں خالی بالوں کا کھپ جانا

کب حضور مسلمانے مرے کا مزا جانا

اور اسی پر غالب کے ہم معنی شعر:

خُدر از زہرِ سبزِ آسورگاں غالبت

چہ دنت ہا کہ ردل نیست جانِ ناشکیبارا

یا

جس زخم کی ہو سکتی ہو تدبیرِ رفو کی

یارب اسے لکھ دیجو قسمت میں مدد کی

یا

گلشن بہ فضلِ چمنِ سبزِ نایست

ہر دل کہ نہ زخمِ خود را ز تیغِ تو دانیست

سرخوشی و سرمستی اب تنہا سے گزر کر روزینے میں شامل ہو جاتی ہے، زندگی کا
 سمون بنتی جاتی ہے۔ اب اسے فوراً سے بھی غرق نہیں رہی، صرف "کنٹینٹ" پر
 نظر ہے۔ عجب نہیں کہ ایسے تمام شعراء، بلکہ اس موڈ اور مزاج کی پے درپے غزلیں
 عمر کے ۳۰ اور ۴۵ کے درمیان کی تخلیق ہوں :

نشاطِ جم طلب از آسماں، نہ شوکتِ جم
 قدحِ مبارکِ زیاقت، بادہ گر نبی ست

ہر انتفاعِ نیرِ زم، در کدو چہ خزاغ !
 نشاطِ خاطرِ مفلس ز کیسا طلبی ست

بہیمپ حوصلہ نقدِ نشاط باید بود

چو بزمِ عشرتیاں تازہ رہ توں جوشید
 چو شمعِ غلوتیاں جاں گداز باید بود

"باید بود" روایت کی غزل اپنی پوری کیفیت میں اسی معنی کی "چاہیے" "رہے"
 والی غزل سے ہم آہنگ ہے :

سر پائے خم پہ جا بیے بنکام بے خودی
 رہ سوئے قبلہ وقتِ مناجات چاہیے

ہے رنگِ لالہ و گل ز نرسِ حُدا بُدا
 ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

مے سے نغمہ نشاط ہے کس رویا کو
 یک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

نشاط معنویں از شراب غائب تست
 فسوں پابلیاں فصلے از فناء تست
 بھام و آئینہ حریف جم و سکندر چیت
 کہ ہرچہ رفت بہر عہد، در زمانہ تست

یہاں "نشاط" کا لفظ ایک ایسی "بے خودی" کے ہم وزن بلکہ قریب المعنی ہو گیا ہے جسے جدوجہد رنگوں سے غرض نہیں، فارم سے، شان و شکوہ سے مطلب نہیں؛ مطلب بے معنی سے، حاصل ہے حاصل سے؛ ذاتی طور پر ہمیں نہ سہی، اوروں کو تو نشاط میسر آئے، اسی میں ہم خوش ہمارا انداز خوش۔

نہیں بہاد کو فرصت، نہ ہو، جب، تو ہے
 طراوت چمن و خوبی ہوا کہیے
 نہیں نگار کو الفت نہ ہو، نگار تو ہے
 روانی روش و مستی ارا کہیے

اسی رنگ اور کیفیت میں ڈوبی ہوئی ہیں وہ غزلیں جن کی روئیں، "دریاب"، "آؤر"، "برقش"،
 "چمٹ"، "بہادر" اور "دینل" میں؛

فرصت از دست وہ وقت نصبت پندار نیست گر صبح بہارے شب، "دریاب"

اس نالہ غلوٹ میں، مجھے چاہیے نہیں، باسوں ساحل در کس مطلوب طلال دغل
 اور اس سلسلے کا نقطہ عروج ہے "بگردانیم" در دین والی غزل، جس کی دھن پر ایرانی اہل فن
 سخن بھی کچھ سر دھنتے ہیں۔

ہمارا شاعر نشاط کی بے خودی اور سرسستی و سرشاری پر قہمتا نہیں، وہ اسے انہر
روح کی آزادی یا "آزادگی" کا سید اور وسیلہ بنا لیتا ہے :
عیش و غم در دل نمی است، خوش آزادگی
بارہ و خونابہ یکسانست در غربال ما

وہ آگاہ ہے کہ غموں سے آدمی کو نہات نہیں ملتی لیکن انہیں ناسور بنا کر پالنے
پر وہ خود کو آمادہ نہیں پاتا :

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس
برق سے کہتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم

خون جگر بھانے سستی ما قدرج نداشت
نالہ دل نواہے نے، رامش ما بچک نخواست

ہرقتہ و نشاط و سماع آورد مرا
گوئی فلک بعبرہ ہنجاہ او گرفت

ہر دم نہ نشاطم دل آزاد بجنبد
تا کیست دریں پردہ کہ بے باد بجنبد

دل چو بیند ستم از دوست، نشاط آخانہ
شیش سازیت کتابشکند، آواز وہ

مثنوی "چراغ دیر"، "سرہ بینش" اور خاص کر "ابر گہر بار" کی تمہید،

ساتی نامہ، مفتی نامہ اور منامات نے ایک سلسلے اور ربط کے ساتھ نشاط و ہر کی ان ساری کیفیتوں کو، اس کی جزائز کو دلوں بیان کر دیا ہے کہ ہم غالب کے تمام کلام کی روح چھو لیتے ہیں اور ہم پر کھلتا ہے کہ غم اور نشاط ان کے ہاں متضاد یا عریض نہیں، بلکہ طبیعت ہیں۔

غم روئی کپڑے کا نہیں، اہل و عیال کا نہیں — بلکہ اس سے فارغ البالی کے بعد کا — جو ہر ایک حساس آدم زاد کا مقدر اور فنکار کی ذہنی غذا ہے، اس کی غلوت اور مرا تھے کا ہم نہیں ہے، جس تو "نشاط" کا لفظ کے ہاں نشاط غم، نشاط عشق، نشاط تنہا، نشاط ہستی، ہزیم نشاط، نشاط خاطر، نشاط دماغ، اندوہ نشاط، گریبان نشاط دکیا بات کہ دی ہے اس ترکیب کے ساتھ:

از شرر گل در گریبان نشاط انگسہ اند

خندہ با بفرصت عشرت پرستان کردہ ایم

یعنی نشاط اور عشرت پرستی کے درمیان دیوار کھڑی کر دی ہے۔ نشاط بہار، نشاط و فکر اور بالآخر "نشاط لذت آزار" کی ترکیب کے ساتھ ملتا ہے۔

غالب بے دہر نہیں کہتے کہ غم و نشاط کی آمیزش سے انہوں نے زندگی کے بندھنوں کو ڈھیلا کر لیا ہے، اور آواز نہ جینے کا ایک ڈھب سیکر لیا ہے:

زمن جون در بہر نحو زیستن

بلکہ خوردن و تازہ رو زیستن

بذائقہ غم آموزگار منست

غزلان فزائل بہار منست

غمے گز ازل در مرشد منست
 بود روزخ آنا بہشت منست

بغم خوش دلم، غم گرام غمست
 بہے دانشی پردہ دارم غمست

ع:

خود رنجید از من چو رنجبم ز غم

از بس کہ خاطر ہوس گل عینہ بود
 خوں گشتہ ایم و باغ و بہار خود ہم ما

شب فراق ندارد سحر دے یکمند
 بہ گفتگوے سمر می توان فریفت مرا

اسباب غم اور سامان نشاط کے تلازم پر اہر گز مبالغہ نہ ہوگا، اگرچہ دعوا
 کہوں کہ غالب کا آپرودج (APPROACH) ذاتی لکھنیل (DIALECTICAL) ہے۔
 جو بنیادی طور پر سائنسی عمل ہے۔ اس موضوع کو ایک الگ مقالے کی ضرورت ہوگی تاہم
 جن کی نظر غالب کے اول تا آخر چوبیس کلام پر ہے انہیں اس جدیداتی تصور حیات کا
 دھماکا اسی آسانی سے مل جائے گا جیسے سمجھ کے دالوں میں بہت ہوتا ہے۔

شروع کی غزلوں میں ہے نا:

مرا پا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی
 عبادت برق کی کرتا ہوں اور نفوسِ حاصل کا

یہ علم ہستی اور الغیب ہستی ان کے ہاں مستقل کشاکش کی صورت رکھتی ہے۔ ایک
 ہمہ گیر اور ہمہ جہت CONFLICT یا تصادم جاری ہے، نرم ہستی میں اور جتنا یہ عقدہ
 کھلتا جاتا ہے، نشاط و رزنی کا ماحی شاعر، برق سے شمع روشن کرنے اور روشن رکھنے
 کے جتن کرتا ہے :

محفلیں، برہم کرے بے گنہہ بازِ خمیاں
 ہیں ورقِ گردانیِ نیرنگِ یکِ بتخانہ ہم

ستم زدہ روح کو راحت کے سارے سرچشموں کا سراغ ملے چکے کے بعد جب
 غالب دیکھتے ہیں کہ انجام کار فنا ہے "کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا"
 تو نشاط کی آخری بوندوں پر لب رکھ دیتے ہیں کہ یہ کہیں بے صرف نہ ٹپک جائیں۔
 جو بے سوختیت ہے اس کا رس بھی کیوں نہ لیتے چلیں۔ یہاں غیبت اور مغفرت کا اظہار
 ہے جو صرت و نشاط یا صرتِ نشاط کی دھلتی کیفیت ہے :

غعباتِ غم کو بھی اسے دل غیبت ہانیے
 بے صدا ہو جائے گلیاں سا نہ ہستی ایک دن

دلایہ دردِ عالم بھی تو مُغفَّتَم ہے کہ آخر
 نہ گریہ سہری ہے، نہ آواہِ نیم شبی ہے

ایک بنگالے پہ سو قوت ہے گھر کی رونق
 قومِ غم ہی سہی، نفرتِ شادی سنہ سہی

عشرتِ صحبتِ خوباں ہی غیبتِ جانو
 نہ ہوئی نالت اگر مرِ طبعی، نہ سہی

غم زمانہ نے جھاری نشاطِ عشق کی مستی
دگر ہم بھی اٹھاتے تھے لذتِ الم آگے

تو گویا نشاط کے مختلف مراسم میں جو "نشاطِ عشق" ہے، وہ لذتِ الم "رکستا ہے۔ غم زمانہ بد بخت نے ایسا ابھایا کہ وہ جو میٹھے درد کی لذت مٹتی تھی، وہ گئی۔ اسی کی بدولت نشاطِ عشق کی مستی میسر تھی۔ یہ خیال طرح طرح سے آیا ہے اور نشاط کے اس نازک پہلو کو آپ بتا گیا ہے :

اچھلے سر انگشتِ حسائی کا تصور
دل میں نظر آئی تو ہے اک بوندِ لہو کی

اس لذت کو نشاطِ حیات کے لیے قیمت کہا گیا ہے — اور اس کے حصول پر اکسایا گیا ہے کہ گھبیرا، اتھاہ اور مردارِ غم کا توڑ ہوتا رہے۔ آخری مگر شوخ رباعیوں میں سے ایک ہے :

بادستِ غم آں باد کہ حاصلِ بیزد
آپِ ریشا ہو شمسند و غافلِ بیزد
بگزاشته ام خمے ز صہب بہ پسر
کش اندو مرغِ پد از دلِ ببرد

مجھے اس رباعی پر ہنسی نہیں آتی، نہ اس میں کہیں کوئی چھیڑ خانی ہے، پرانی منگول تاجدارِ رسم تھی کہ جس گھر میں موت ہو جائے، وہاں مردے کو رخصت کرنے کے بعد سوگوار عزیزِ رشتہ دار سیدھے مرحوم کے گھر واپس آتے ہیں، خاموش بیٹھ جلتے ہیں اور تیز شراب کا تیز دُور چلتا ہے، مرحوم کے صفات بیان کرتے ہیں۔ نئے کے ساتھ

رقت طاری ہوتی ہے، پھر خاموشی تھوڑی دیر کے لیے، پھر زحمت۔ گھر والے اسی حالت میں غم سے سبکدوش ہو کر پہلی رات سو رہتے ہیں۔ غالب کو یوں ممکن ہے اس غم کی خبر نہ ہو۔۔۔۔۔ ان کے خون کی بعضی لورزشوں کو منور اس کی خبر نہ رہی ہوگی کہ وہ ظاہر ازماہ مذاق اولاد کے لیے درشتے میں شراب کا شکا چھوڑے جا رہے ہیں تاکہ اس نشا لہ بے خودی میں وہ اپنا غم غلط کر سکے۔

حضرات جو بات مجھے کہتی تھی اس کی وضاحت کر چکا۔ البتہ ایک نکتہ جو دور انکار بھی نہیں ہے اور بالکل سلسلے کا بھی نہیں:

شیخ اکرام مرحوم نے غالب کے سلسلے میں "باہر پیش کوشش کہ عالم دوبارہ نیست" کا حوالہ دیتے ہوئے مظلوم کی پیش کوشش کی جانب توجہ دلائی تھی۔ میں اس توجہ کو ذرا آگے تک بے جانا چاہتا ہوں۔

منگول قاتار قبائل کی کامیاب جمہاندی اور فتوحات کے بعد بقول آرنلڈ ٹونہلی جب وسط ایشیا اور مغربی ایشیا کی سلطنتیں تباہ ہوئی گئیں اور ایک نئی قسم کی عالمی اسٹیٹ بننے لگی تو وسط ایشیا اور ایران کے متحد نسل گروہوں سے ان خوں خوار قبائلیوں کا خون ملا۔ اور دو تین نسلوں کی مسلسل آویزش کے بعد تخریب نے تعمیر کا رنگ پکڑا۔ بچے بعد دیگرے مغل امیروں اور والیان حکومت کے "توزک" (یعنی AUTOBIOGRAPHIES) گواہ ہیں کہ منگول تاتار فطرت پرستی (PAGANISM)

نے خدا کا واحد کی توحید پرستی میں مدغم ہو کر عقیدے اور قدیم رسم کا پوند طلا کر جیوئی سیہ ہوتی رنگارنگی پیدا کی۔ ہندوستان کے فرنٹ پر گئی صدی پہا ہونے کے بعد سولہویں صدی کے آغاز سے اٹھارہویں صدی کے وسط تک سیاسی اقتدار ان کے ہاتھ میں رہا، اور یہاں پھر ایک آریائی فطرت پرستی کا گلاب اس بادۂ صفا میں آئینہ ہو۔ جارحانہ پیش دہرائی نے تخیل اور فکر کے مالا مال خزانے میں منہل کر قدم رکھنا سیکھ لیا تو ایک آدھ نسل میں ہی اس کے طور طریقے بدل گئے۔ رفتہ رفتہ اس نے نشاط پسندی کی صورت اختیار کی۔ بزم آرائی، باغوں کی آرائش، سرگرمیں، انہریں۔

مصل سرائیں، کارواں سرائیں، مقبرے اور مقبروں میں مدرسے، مدرسوں میں علمی مناظرے، ہوا مصل، جنگ مصل اور اسی طرح کے سیکڑوں آثار اس نشاطِ پندگی کے گہرے نقوش موجود ہیں۔

• رواج کے زمانے میں فاتحانہ جذبے کی شدت ایک مقام پر آکر ٹھہر جاتی ہے اور پھر حکمران مطلقوں کی اور ان کے بنائے سہائے تہذیبی تاروپود کی بندش کمزور پڑنے لگتی ہے۔ یہاں تک کہ زوال کا گہرا مچھا جاتا ہے۔ یہ کوئی عجوبہ نہیں کہ اس گھنے کہرے میں چڑا کے بھڑکنے کی صورت تہذیبی عمل میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ اٹھارہویں انیسویں صدی کے ہندوستان میں بہترین اور جامع فارسی لغات کا تیار ہونا بھی اسی تہذیبی عمل کی شدت کا پتا دیتا ہے۔ ”گزنے لنگی گزوی پگڑی تب خبر پڑی“ کہ کہاں کہاں پائے مضبوط کرنے ہیں، کہاں ٹیکے لگانے ہیں اور کس کس خزانے کی چابیاں محفوظ کر کے رکھنی ہیں۔

نائب کا بدن تو یقیناً اس سیاسی اور سماجی زوال کے تقریباً آخری دور کی پیدائش ہے۔ لیکن ان کا فنکارانہ ذہن اس عہد کی بے مبرانی آگہی کا پالا ہوا ہے۔ "آشوب آگہی" کی ترکیب ایجاد کر کے غالب نے اس نگینے میں منی ایچر پینٹنگ رکھ دی ہے چشم واکشورہ - وغیرہ ترکیب کو بھی اسی قبیل سے شمار کرنا چاہیے۔ عہد ماضی سے اپنی وابستگی کو انہوں نے چھپایا نہ ٹھکرایا، نہ اپنی ٹوٹی بدلی نہ فرغل، اور اس کے باوجود مستقبل کو جس کا بلٹووزہ خود انہی کے دیوان خانے اور محل سراپہ سے گزرنے والا تھا، آہنی مرکز درملوے کہو جو انہی کے عروج وں کا پائین باغ کات کر گزرنے والی تھی، انقلاب آفریں شمار کیا۔ انہوں نے اپنی وفاداری تقسیم کر دی۔

ایک طرف اپنے آباد و اجداد کے اصلی اور کچھ فرضی افراسیابی نسب نامے پر فخر، پھر اوستا کی قبل از اسلام کی فارسی لکھنے کی سڑک — خود کو رئیس اور نصیدار قرار دینے کی کوشش — یہ اور اسی طرح کی جسمانی اور ذہنی تنگ و دو ایک سلسلے میں جوڑ کر دیکھی جائے تو یہ ذہنی اور جسمانی حصول نشاط کی ایسی کوششیں

نظر آئیں گی جن کی ہم آسانی کے لیے BIO-CULTURAL PHENOMENON قرار دیں گے۔
 اوپر کی اتنی ساری پھلنیوں سے چھن کر جو ہوان کی رگوں میں دوڑتا پھرتا تھا اسے
 محسوس حالت میں بھی روتی بسورتی، کعبہ افسوس ملتی، اندوہناک زندگی کا اور پیشانی بھر
 برتاؤ کا روپ گوارا نہیں ہو سکتا تھا۔ "اپنی شناخت کی تلاش" سے غالب کبھی بے نیاز
 نہیں رہے تاہم تلاش کے بغیر بھی اس نشاط کا عنصر ان کو شگفتہ رکھنے کے لیے کافی تھا
 جس نشاط میں فکر کا درد، قہقہے کی کشاکش اور ناکردہ گناہوں کی حسرت کی داونٹنی کا
 تقاضا گھٹلا ہوا تھا۔

کیا اب بھی جتانے کی ضرورت باقی رہ گئی کہ غالب ہمارا اشک طلب نہیں، نشاط
 طلب اور نشاط آموز شاعر ہے؟

غالب اور سبک ہندی

ملک اشتر محمد تقی بہادر صرف اپنے زمانہ کے سب سے بڑے شاعر اور مجاہد ہی نہیں تھے بلکہ فارسی زبان و ادب اور مشرقی تہذیب کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے تھے، وہ ایک اپنے اور شفیق استاد، رحم دل انسان، انتہائی منکسر مزاج، ہندوستان دوست اور دانش مند تھے۔ علمی اور تحقیقی دنیا میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے فارسی کے مختلف سبک یا اسٹائل کی صحیح نشاندہی کی اور ان کے امتیازی خصوصیات کے فرق کو واضح کیا۔ یہی وجہ تھی کہ تہران یونیورسٹی میں سبک شناسی کی ایک کرسی قائم ہوئی، جس کے سب سے پہلے وہ استاد تھے۔ ان کی کتاب سبک شناسی "ہوتمن جلدوں میں ہے، فارسی ادب کی تاریخ کے مطالعہ میں ایک سنگ میل کا کام کرتی ہے اگرچہ یہ صرف فارسی شہر بدشت ہے، مگر اس سے شرکی دنیا میں بھی کلام کو پرکھنے میں مدد ملتی ہے آپ فرماتے ہیں،

• سبک شناسی ہمنای محقق خود در ایران سابقہ ای ہدا شہ است

... پس از تئیر سبک شعر از شیوہ عراقی بشیوہ ہندی کہ در زمان صنویہ

صورت گرفت، بمقتان و شعر شناسان بایں سنی بر غور دند کہ طریقہ شعر با قدیم

تفاوت کردہ است ... در آن مصر ... شعرائی بودند اندک با بک ہندی
 انس نہ گرفتند و بشیوہ استادان قدیم راغب تر بودہ اند دریں رویہ
 در عصر سلطان حسین و نادر شاہ و زندیہ قوت یافتہ ، شیوہ ہندی مطلق
 و متروک و بک و طریقہ متقدمان مطلوب و مرغوب گردیدہ

ملک الشعراء بہار کے انتقال کے بعد ڈاکٹر حسین خطیبی کو ان کی جگہ ملی انہوں نے
 بک شناسی پر ملک الشعراء کی نگرانی میں کام کیا تھا۔ مگر ان کی کتاب آج تک شائع نہ
 ہو سکی ، اور باوجود غیر معمولی ذہانت کے ، ادبی اور علمی دنیا سے زیادہ سے زیادہ دور رہنے
 لگے اور ملک کے دوسرے سرکاری اداروں جیسے "شیر و خورشید" یعنی ریڈیو کراچی وغیرہ سے
 متعلق ہو گئے اور انھیں چیزوں میں اپنا وقت صرف کرتے رہے۔ ویسے وہ میرٹ بڑے
 شفیق استاد رہے ہیں۔

تیسری نسل میں ڈاکٹر محمد جعفر محبوب ہیں جو میرٹ ہم کلاس ہی تھے اور جن کی ماٹا
 کتاب "بک خراسانی در شعر فارسی" اس سلسلہ کی ایک اہم کنزی ہے ، بہر حال اس
 میدان میں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے ، تاکہ مختلف سکوں کی زیادہ سے زیادہ چھان بین
 ہو سکے۔

فارسی کے تین ممتاز سکوں یا اسلوبوں میں سب سے پہلے بک خراسانی آتا ہے ،
 جو خراسان کے علاقہ میں تو ضرور پھولا پھلا ، مگر اس کے باہر بھی کار فرما رہا۔ اس بک کی
 نشوونما میں قصیدہ کو سب سے زیادہ دخل ہے اور اس بک کے ساتھ اس صنف کس
 نے زیادہ رواج پایا۔ سادگی ، صفائی ، فطری تشبیہات و استعارات ، شکوہ الفاظ ، امیل
 لہجات وغیرہ اس کی نمایاں خصوصیتیں ہیں ، نیز اس کے نمایاں شاعروں میں منقری دوم ۱۳۳۱ھ
 قزحی (م ۱۳۲۹ھ - ۱۰۳۷ھ) ، منوچھری (م ۱۳۲۲ھ - ۱۰۳۰ھ) ، ناصر خسرو
 (م ۱۳۸۱ھ - ۱۰۸۸ھ) وغیرہ ہیں۔

دوسرا دور بک عراقی ہے ، جس نے جنوب ایران میں نشوونما پائی ، مگر تمام فارسی
 دنیا میں مقبول ہو گیا۔ اس کے سب سے بڑے طہر دار سعدی (م ۹۹۳ھ یا ۹۹۱ھ - ۱۲۹۱ھ)

اور حافظ (م ۷۹۱/۸۹ - ۱۳۸۸) ہیں، نیز اس دور میں سب سے زیادہ مقبول صنعت سخن غزل رہی ہے۔ اس کی خصوصیات میں آئندہ جذبات نگاری، رقت اور الفاظ کی نرمی اور روانی وغیرہ شامل ہیں۔

تیسرا دور بک ہندی کا ہے جس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ طرز صرف ہندوستان میں رائج تھا یا عالم وجود میں آیا البتہ ہندوستان کی آب و ہوا اور معیشت و فلسفہ نے اس بک کو جلا دیا ہے، اس بک کی نمایاں خصوصیتیں منی آفریں، آورد، دور از فہم خیالات، پیچیدگی عبارت، نیز فطری تشبیہیں اور استعارے وغیرہ ہیں۔ ایرانی حضرات عام طور سے ان بکوں میں، بک ہندی کو بہت اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔ البتہ بعض نے اس کو بہت سراہا ہے۔ مگر تعریف کی صورت میں اس کو بک اصفہانی کہہ کر یاد کیا گیا ہے۔ امیری فیروزکوئی نے اس بک کی بہت تعریف کی ہے، مگر بجائے بک ہندی کے اس کو بک اصفہانی بتلایا ہے۔

اس بک میں زیادہ تر قصیدوں اور غزلوں کو رواج ہوا۔ حضرت امیر خسرو دہلوی (۶۵۱ - ۷۲۵/۱۲۵۳ - ۱۳۲۳) اس بک کے بانی کہے جاتے ہیں، مگر ان کے بعد رفتہ رفتہ اس بک میں مبالغہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ بیدل (م ۱۱۳۲/۱۴۲۰ - ۱۲۱۱) نے اس کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ بیدل ہندوستان، افغانستان اور تاجیکستان میں بچہ مقبول ہوئے، مگر ایران میں ان کی قدر و منزلت نہ ہو سکی۔ افغانستان میں ان کو فاکا کاسب سے بڑا شاعر مانا جاتا ہے اور بیدل شناسی ایک خاص اصطلاح بن گئی ہے۔ کلیات بیدل بڑے اہتمام سے چار جلدوں میں کابل سے شائع ہوا ہے جن کا وزن تقریباً آٹھ کیلو ہوگا۔

مغل سلطنت کے عروج کے ساتھ، بک ہندی کو خاص طور سے ترقی کرنے کا موقع ملا، نیز عرفی (م ۹۹۹/۹۱ - ۱۵۹۰)، نظری (م ۱۰۲۱/۱۳ - ۱۶۱۲) صاحب (م ۱۰۸۰ - ۱۱۸۰/۱۶۶۹ - ۷۷/۱۱۸۰)، شیخ علی حاتمی (م ۱۱۸۰ - ۱۲۶۹/۱۶۶۹ - ۷۷/۱۱۸۰) وغیرہ اس بک کے بڑے نمایاں شاعر کہے جاتے ہیں، مگر ان میں سے اکثر وہ ہیں جو ایران میں زیادہ شہرت نہ پا سکے۔ صاحب کے علاوہ جو زیادہ تر ایران میں رہے دوسرے شعرا

نسبتاً گننام سے رہے، جب کہ ہندوستانی درسگاہوں میں ان کے مطالعہ پر اصرار کیا جاتا تھا اور کیا جا رہا ہے۔

بہر حال جب غالب نے کچھ کمولی تو اس وقت انہیں شعرا کا نام ہندوستان میں گونج رہا تھا اور یہاں کے شعرا ان کی پیروی کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔

غالب کو اپنی فارسی شاعری پر پھر دوسے زیادہ فخر تھا اور ان کا دھوا تھا:

فارسی ہیں تا بہین نقشبای رنگ رنگ

بگز از مجموعہ اردو کہی رنگ من است

مگر اس وقت فارسی ہندوستان میں نافذ رہی تھی اور ان کی عظیم شہرت کا سبب

ان کا اردو کا سراپہ ہے۔ بہر حال اگر غالب اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر مانے جاتے ہیں، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کو فارسی ادب میں بھی وہی درجہ حاصل ہے۔

فارسی غزل کے سب سے بڑے شاعر خواجہ حافظ شیرازی ہیں، جن کو دنیا کے

عظیم ترین شاعروں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے غزل کو ایک نیا رنگ اور مزاج

عطا کیا، نیز انھوں نے حقیقت اور مجاز کو انتہائی خوب صورتی سے جمع کر کے ایک دوسرے

میں پیوست کر دیا۔ حافظ تنہا شاعر ہیں جو بچے، بوڑھے، جوان، سبھی کے ساتھ چل سکتے ہیں

اور انھیں متقی و شرافتوار، رند و پارسا سبھی دل سے پسند کرتے ہیں۔ سہل پیش کے ساتھ

ساتھ ان کا کلام غیر معمولی عمق کا حامل ہے، جو سعدی کو بھی میسر نہ ہو سکا۔ مجھے یاد ہے کہ

جب میں ۱۹۶۹ء میں محمد حسین شہریدہ سے ملا، جو فارسی اور ترکی دونوں زبان کے سب سے

بڑے شاعر مانے جاتے ہیں، تو انھوں نے فرمایا کہ آج تک کوئی دانشور حافظ کو پوری طرح

سے نہ سمجھ سکا۔ شاہ نام تخلص بآفتاب (۱۷۲۸-۱۸۰۶ء) نے اس مطلب کو اس

شعر میں ادا کیا ہے:

کس آشنا نبود آفتاب از حافظ

ہزار بار من ایس نکته کردہ ام تحقیق

اردو اور فارسی کا شاید ہی کوئی غزل گو شاعر جو حافظ کا پیرو اور مقلد نہ ہو۔ صرف

اقبال ایسے شاعر ہیں جو ایک طرت تو حافظ کی عظمت کے قائل ہیں اور غزلوں میں ان کی پیروی بھی کرتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں:

خونِ رگِ سہار کی گرمی سے ہے تعمیر

میزانِ حافظ ہو کر بتِ خانہ شیراز

ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں: "اقبال نے خلیفہ عبدالحمید کے جو اس کے متروکوں اور مستقدوں میں تھے، ایک مرتبہ گفتگو کے دوران میں کہا تھا کہ "بعض اوقات مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حافظ کی روح مجھ میں ملول کر گئی ہے۔"

اقبال نے بہت سی غزلیں حافظ کی غزلوں کو سامنے رکھ کر کہی ہیں، اس قسم کی غزلوں کے کچھ اشعار یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

حافظ

جز آستان توام در بہانِ پناہی نیست

سر مرا بجزوایں در حوالہ گاہی نیست

اقبال

اگر پر زیب سرش انسر و کلاہی نیست

گدای کوئی تو کمتر ز پادشاہی نیست

حافظ

روشن از پر تور و ریت نظری نیست کہ نیست

مستِ خاکِ درت بر لبِ کی نیست کہ نیست

اقبال

سر خوش از بادۂ تو خم شکنی نیست کہ نیست

مستِ تعلیمی تو شیرین و ہنی نیست کہ نیست

نواب حافظ فرماتے ہیں:

نہ ہر کہ چہو برافروخت دلبری دانند نہ ہر کہ آئینہ ساز و سکندری دانند

عراقی شیرازی کہتے ہیں :

طریقِ دلبری تو مگر پری داند

کہ آدمی نہ بدینِ شیوہ دلبری داند

اور اقبال کہتے ہیں :

جہانِ عشق نہ میری و سروری داند

بہیں بس است کہ آئینِ چاکری داند

مگر دوسری طرف اس لسانِ العذیب اور ترجمانِ العذیب کو برا بھلا کہتے ہیں اور ان کو انحطاط کی علامت سمجھتے ہیں۔ نیز انھیں ایک شرابی اور گمراہ کن شاعر بتلاتے ہوئے لوگوں کو ان کی پیروی سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کہتے ہیں :

ہوشیار از عافیتِ صبا گار جامش از زہرِ اجل سراپہ دار

نہیست غیر از بادہ در بازار او از دو جام آشفته شد دستار او

بی نیاز از محفل حافظ گذر الحمدہ از گو سفتہ ادا الحمدہ

یہ بالکل صحیح ہے کہ ایران کی سیاسی تاریخ کے سیاہ ترین صفحات اس کے ادب کے روشن ترین اوراق ہیں۔ چنگیز خاں اور ہلاکو کے حملوں نے اسلامی دنیا کی ریش سے اینٹ بجا دی تھی، مگر اس زمانہ میں سب سے بڑے صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی سب سے بڑے فارسی نثر نگار سعدی، نیز منہاج سراج جرجانی (م۔ ۶۹۰ھ / ۱۲۵۸ء) عطارک بونہی (م۔ ۶۸۲ھ / ۱۲۸۲ء) عوفی (م۔ ۶۳۵ھ / ۱۲۳۷ء) اور خواجہ نصیر الدین طوسی (م۔ ۶۷۲ھ / ۱۲۷۳ء) جیسے بڑے مصلح اور نثر نویس پیدا ہوئے، تیمور لنگ نے چنگیزی روایات کو دوبارہ زندہ کیا اور ایران میں قتل و خون کا بازار گرم کر دیا۔ یہ زمانہ ایران کی طوائفِ الملوک اور بچاگرگی کا عہد ہے مگر اس زمانہ میں بہت سے عظیم المرتبت شاعر پیدا

ہوئے۔ نیز حافظ جیسا زبردست شاعر عالم وجود میں آیا، جو فارسی ادب کا سب سے زیادہ درخشاں ستارہ ہے۔

اردو ادب کے متعلق بھی ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ انیسویں صدی میں ہندوستان میں طوائف الملوک اور کیمپرسی کا دور تھا، جب کہ انگریزی سامراج نے محض سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے اور ملک افراتفری کا شکار ہو گیا تھا، مگر اسی دور میں اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر اور غزل گو اسد الشدخاں غالب کا جنم ہوا، جو دنیا کے بڑے شاعروں میں شمار کیے جاسکتے ہیں۔

غالب ان بڑے شاعروں میں سے ہیں، جنہوں نے حافظ کی عظمت کو مانا اور سراہا ہے، تقریباً دیوانہ حافظ میں لکھتے ہیں :

”ازدلا گہرائی کو پشت خود را بازادہ روی و بگنج باد آوردن ہنگامہ خسروی
گم گم گرم کردہ اند، آن موبد موبدان آتشکدہ راز، آمدوی پارس و رنگ بوی خود، نکتہ سیخ
شیراز، در آئین غزل فرد، و خنفس رویا را از عالم معنی رہ آوردہ است، تو قیام ہمنہ پیش
را تمغای بی بی و منشور سننوریش را عنوان اسان انصیری۔ فرشتہ از آسمان فرود آیندہ را
ہرچہ برہم شود در زاویہ خیرش نمود پذیرد، و سرودش زمزمہ دہی سراپندہ را ہرچہ از یاد رود
ہم از زبانش بدل بازگیرد۔ مناسب کہ مراد را از ہی نمود کلاہی و بدو خنفس را ہی، حسن را
باراستگی زبور تشبیہ شورش ہی شاید، جانے کہ می فرماید، فرد :

فدای حسن خدا دار او شوم کہ سراپا

چو شعر حافظ شیراز انتخاب ندارد

دیوانش کہ مقتضای کمال غزل، خیم زخم نگندگان نگرندی داشت، از نفس ریزہای
بکوشش سوختہ دانا یان آرزوی سپندی داشت۔ چون این کار را کنش اندیشہ ای و
ایں آرزو را دانش پیشہ ای می بایست، پس از آن کہ سپہر بسی بہنہار چیدانی، ایں کا بگشت
و صدرہ بحانہ روائی، ایں آرزو گذشت، دانشوری را از فرنگ کہ گوہرش را فردغ دانش
و فرنگ ست، بفرماں شایستگی بدین کار دستوری دادند و دلش را بدین آرزو دلیری

بختیہند، تابہستن شیرازہ این محمود کفت کثاد و بکثودن گہ ہاے این رشتہ کمر بست۔
 بیگانہ گیاه باہیں روضہ بشا سادری باز درود، تیروز نگار با ازیں آئینہ روشن گری در زدود۔
 بکشایش اندازہ ہر گرفتار فہرستی بدان بر بست و بآرایش سیما ہر سخن در بیامہ ابدان
 باز ہوست، چنانچہ بد بیامہ امی کہ در سر آغاز کتاب نکاشستہ اوست از نور ہر پردہ خیر
 بازی دہد و اندیشہ را رنگ رنگ ہوش مندی نشانہاں رازی دہد، مشغوی :
 بدہر آرایش دیوان حافظ کہ باشد آیتی در شان حافظ
 دگر نوشد ز میسر جان جاگوب جو یوسف کان پدید آندہ یعقوب

زہی نازک خیال نکستہ پرداز کہ در ہندش رسد مہباز شیراز
 می زوش بہام و شیشہ اند زستی در سخن نامش قلندر
 ندایا تا جانیہا از زبانہاست زما فظہ بر زبانہا داستانہاست
 از این دیوان و دش را تازگی باد کماش را بلند آوازگی باد
 ایک قطعہ میں کہتے ہیں :

در ہانگ زنی کان ہمہ دادند بہافظ
 گویم بکاش باد و لیکن چہ شد ہیں را

حافظ کے اشعار اتنے ضرب المثل ہو گئے تھے کہ تمام صاحبان ذوق ان کو موقع
 اور محل پر استعمال کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔ غالب وغیرہ بھی حافظ کے اشعار سے
 جگہ جگہ استفادہ کرتے تھے۔ جب ان سے بحیثیت مورتی کے بعض مضامین نے سوالات
 کیے تو آپ نے جواب دیا :

ما قصہ سکندرو دارا خواندہ ایم
 از باجوہ نکایت و ہر وفا مہر سست

مگر حافظ کی شاعری کسی شاعر کے لیے ممکن نہ تھی، اس لیے کہ اس میں سلاست

اور منطق، حقیقت اور مجاز دونوں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ غالب نے حافظ کی غزلوں کو
 سامنے رکھ کر غزلیں کہی ہیں، مگر ”چہ نسبت خاک را با عالم پاک“ بہر حال یہاں
 دونوں کی ہم طرح اور ہم ردیف اور ہم قافیہ غزلوں کے منتخب اشعار نقل کیے
 جاتے ہیں :

حافظ

ساتیا بر خیزد در دہ جام را خاک بر سر کن غم انیام را
 غالب

چوں بقاصد بسپرم پندم را رشک نگزد ارد کہ گویم نام را
 حافظ

چوں چشم تو دل می برد از گوشہ نشینان ہمراہ تو بودن گز از جانب مانیست
 غالب

گلشن بہ نضای چمن سینہ مانیست ہول کہ نہ زخمی خورد از تیغ تو دانیست
 حافظ

نہ من بر آن گل یار من خوں سرایم و بس
 کہ عندلیب تو از ہر طرف ہزارا مند

تو دستگیر شوی خضر بی خمستہ کہ من
 پیادہ می روم و ہمریان سوارا مند

غالب

تو سر مرہین دورق در نورد و دم در کش نبین کہ سحر نگاہاں سیاہ کارا مند
 ز دید و واو وزن حریف خرد سالانہد بگردہ راہ منہ چشم نے سوارا مند

ز چشم زخم بدیں حید کی رہی غالب

و گر گلو کہ چو من در جہان ہزارا مند

حافظ سے بھی زیادہ معتدی فارسی زبان و ادب نشر و نظم کے جاننے والوں کے لیے

بہترین نمونہ تھے۔ کوئی فارسی کا شاعر یا ادیب ایسا نہیں ہے، جس نے سعدی کو نہ پڑھا ہو۔ غالب کے لیے سعدی کی پیروی کرنا اظہارِ من اشمس ہے۔ فرماتے ہیں،

”ملقِ غالب نگرد و شہِ سعدی کہ سرود
”خوبرویانِ جفا پیشہ و قانیز کفنہ“

غالب ایرانی شعرا سے بہت مرعوب تھے اور ایرانیوں کی فارسی کو اصل فارسی مانتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں وہ ہندوستانی شعرا کی فارسی کے قائل نہ تھے۔ نیز خود کو فارسی طرز میں ایرانی سمجھتے تھے،

غالب زہند میت فوئی کہ می کشیم گوئی ز اصفہان و ہرات و قیم ما

گرفتہ خاطر غالب ز ہند و اعیانِش بران مرست کہ آوازہء مجم گرد

یہ غالب ہند بھی از گلستانِ علم من ز غفلتِ طوطی ہندستان ہمیش

غالب باختیارِ ریاستِ زمین نخواہ گرفتہ کر سیرِ بلادِ مجم کفم

غالب از خاکِ کہدورتِ خمیز ہندم دل گرفت

اصفہان ہے مذہبِ شیراز ہے تبریز ہے

حضرت امیر خسرو اس سے سستش ہیں، غالب نے حضرت امیر خسرو کے کمال کا اعتراف کیا، ان کی پیروی کی ہے اور ان کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں۔ ایک خط میں سرود کو لکھتے ہیں:

”ہندوستان کے سنوڑوں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ

کے سوا کوئی استادِ سلمِ الثبوت نہیں ہوا اگر کچھ قلم و سخن طرازی ہے یا

ہم چشمِ نظامی گنجوی و ہم طرحِ سعدی شیرازی ہے۔ منت، مسکین اور واقف

قتیل یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کا نام لیجے۔ ان حضرات میں مالم علوم

وہی کے محقق ہیں۔ خیر ہوں، فاضل کہلاؤں، کلام میں ان کے مڑا
 کہاں؟ ایرانوں کی کسی ادا کہاں؟ مجھے
 اب یہاں ہم ان دونوں شعرا کی ہم طرح اور ہم روایت و قافیہ غزلوں کے چند
 اشعار ذیل میں نقل کرتے ہیں:

خسرو

بسی شب باہمی بودم کجا شد آن ہر شبہا
 گمگون ہم ہست شب، لیکن سیاہ از دود یار بہا
 بیا ای جان ہر قالب کرتازندہ شوند از سر
 بگویت عاشقان کز جان تہی کردند قابہا
 مرنج از بہر جان خسرو اگر چہ می کشد یارت
 کہ باشد خوب رویان را ہی زین گونه مذہبہا

غالب

کند گز منکر تعمیر حسرا یہاں ما گز و دن
 نیا بدشت مثل استخوان بیروں ز قابہا
 خوشاندی و جوش ژندہ رود و مشرب مذہبش
 بہ لب فشکی چہ میری در سراستان مذہبہا
 مبادا ہم چون تار سجدہ از ہم بگسلہ غالب
 نفیس با این ضعیفی برتا بد شور یار بہا

خسرو

نوشین بے کہ علش نوکر و جام ہم را
 ہست از پیش خرابی درویش و مستمدا
 گفتی کہ غم ہی خوب، من خود خورم و لیکن
 اہی گنج شادمانی اندازہ ایست غم را

غالب

کاشانه گشت ویران ویرانه دلکشتر دیوار دود سازد زمره انیسان غم را
در مشرب حریفان رخ است خود نمائی بنگر که چو سگند آئینه نیست جم را

خسرو

دیدم بسی زمانه مرو آزمای را سازنده نیست هیچ امیر و گدای را
روزی که می رود مشرب خسرو ز عمر دلا همان قدم که پرستی خدای را

غالب

دل تاب ضبط ناله ندارد خدای را از ما مجوی گریه بی پای های را
ناله بدیدم از همه خواهم کزین پس کنی گوئیم و بهرستم خدای را

خسرو

گفتی که هم آغوشش غیالم بهر سان خواب خوش بمنون بهر دست نهان نیست

خسرو ز تو که دل بستد صاحب حسنی خوش باش که یوسف به کی قلب گران نیست

غالب

در شاخ بود موج گل از جوشش بهار را چون باده به مینا که نهان ست و نهان نیست

ناکس ز تنوستندی ظاهر نه شود کس چون سنگ سر بر در گران ست و گران نیست

خسرو

لاله از می پیاله می گیرد آن که چنانه پژ شود دگر ست ساقی من روان کن از گفت کشتی من که عمر بد گذر ست

گل ورق راست کرده از شبتم

مهر و آن ورق همه گهر ست

غالب

کشتہ راز شک کشتہ دگر ست من وزخمی کہ بدول از جگر ست
 ریزد آن برگ دایں گل افشانہ ہم خوں ہم بہار و رگزر ست
 کم خود گیر و بیش شو غالب
 فکرو از ترک خویشتن گہر ست

خسرو

زلفت بظلم گر بہ جہانی فرو گرفت نتوان ہمہ جہاں بہ پی تار مو گرفت
 ساقی بیاری کہ چنان سوختن عشق کہ سوز این کباب ہمہ نازہ بو گرفت
 ہاں دروہ بود خسرو مسکین ز نیکوان
 عشق تو نگہاںش در آبد فرو گرفت

غالب

گل را بجم عریضہ رنگ و بو گرفت راہ سخن بہ عاشق آرم جو گرفت
 رضوان چو شہد و شیوہ غالب حوالہ کرد بیچارہ باز دلووی مشک بو گرفت

غالب کے زمانہ میں سک ہندی کا بچہ زور تھا اور بیدل نے اس کو انتہائی پرپیہ اور فلسفیانہ بنا دیا تھا۔ غالب پر بیدل کا بہت اثر تھا اور انھوں نے ان کی غزلوں کو سانسے رکھ کر غزلیں بھی کہی تھیں۔ یہاں دونوں کی ہم طرح اور ہم روایت و قافیہ غزلیں نفس کی جاری ہیں :

بیدل

ہر غزتم و اسوخت آخر خود نسا ئیما بر آورد از دلم چوں نالہ اہل پار سائیما
 تو از سر شستہ ہمہ ہیر زاہد نہ غلی در ست نہ از نسق غلوت تار چوں پار سائیما
 ہاں غنیمت کد میں شیوہ دشوار است : مانہ
 نفس در خون پیسید و گفت پامہ آشنایما

غالب

پس از عمری که فرودم به مشق یار سائیها
گدا گشت و به من تن در نداد از خود نمائیها
فغان زان بوالهوس برکش محبت پیشکش کن

در بایه حرمت آموزد به دشمن آشنائیها
پر خوش باشد دو شاگرد را به بحث نازمچیدن
نگردد نکته زائیه نفس در مرمر سائیها

ببَدَل

داغِ عشقم نیست الفت با تن آسانی مرا
چچ و تاب شعله باشد نقش پیشانی مرا
بی سبب در پرده ادهام لایق داشتم
شد نفس آخر لب انگشت حیرانی مرا
میرد از موج بر باد فنا نقش حباب
تنجِ خو نخواهست تبدیل چین پیشانی مرا

غالب

بر نمی آید ز چشم از جوشش حیرانی مرا
ده که پیش از من بیا بوس کسی خواهد رسید
شد نگر ز تندرستی سلیمانی مرا
تشنه بمرسائل دریا ز غیرت جان دهم
گر به موج افتد گمان چین پیشانی مرا

ببَدَل

نباشد گر کند موج تر دستی بجایش را
زرق جلوه اش اگر نیم یک اینده دوانم
که می گیرد عنان شعله رنگ متالش را
که مالم چشم خفاش است نور آفتابش را

غواش معرق شوخ رسیدن در میان داد و نخواهم رفت اگر از خود کوی گوید جوابش را

غالب

سپوم دوزخ دکن داغهای سینه تابش را

سزای بود در ره قشع برق عتابش را

زمن کز بے خودی در میل رنگ از بوی نشانم

بهر یک شیوه نازش بازمی خواهد جوابش را

ز خوبان جلوه و زمای خوداں جان رونما خواهد

خریدارست ز انجم تا به ششم آفتابش را

بیتل

قال تسلیم زن و شوکت شای دریاب گردنی خم کن و سراج کلاهی دریاب

دام تسخیر دو عالم نفس نویدی ست ای ندامت زده سر رشته آبی دریاب

فرست صحبت گل پا بر کاب رنگ ست

آرزو چند اگر هست نگاهی دریاب

غالب

عالم آئینه لرزست چه پیدایچه نهال تاب اندیشه نداری به نگاهی دریاب

گر به معنی ترسی جلوه صورت چه کم ست خیم زلف دشمن طرب کلاهی دریاب

خیم افسردگیم سوخت کبانی اسه شوق

نغم را به پرانتزانی آبی دریاب

بیتل

نگه نظاره کند از میانها نش و لرزد زبان سخن کند از تنگی دانش و لرزد

چه شوکت است از بگاوهن را که تبسم بهوسد از لب موج گهر دانش و لرزد

زبک شرم سجودش گذاشت پیکر بیتل

یو مکی آب نهد سر بر آستانش و لرزد

غالب

دگر بجام خود ای دل پر مهر برد توانی ز سادۀ کزنی بوسه بردایش دلزد
نترسد از گستن خدا نخواست باشد چو رسد سر آن طره بر میانش دلزد
گر از فشاندن جهان شوز نیست در سر غالب
چرا به سبزه نهد سر بر آستانش دلزد

بیتدل

بر سینۀ داغهای تمنا نوشته ایم یک لاله زار نسته سودا نوشته ایم
منشور تاج اگر بسیرگی نبوده اند ماهم برات آبله بر پا نوشته ایم
بیتدل مآل سرکشی اعتبار
پیش از فنا نقش کف پا نوشته ایم

غالب

عنوانی راز نامه اندوده ساده بود سطر شکست رنگ بیهان نوشته ایم
در هیچ نسته معنی لفظ امید نیست فرنگ نامه ای تمنا نوشته ایم
دارد رخت بخون تماشا خطی ز حسن
روشن سواد این درق نا نوشته ایم

بیتدل

بمانم مرده وصلی که شد برق افکنی بشوم که چو موج از آغوشم برون می تازد آغوشم
بمیرت بکمر جویدم نگاه افروده شرکاک شد من آن آیین نام کز شوقی جوهر نهد پو شوم
چو خواب بروم دیوانه تعبیرم جنون دارد بیاد من کش زحمت فرا بوشم فراموشم

غالب

اگر خود نمی بالند نارس کردنی بوشم مراد را از چه دشوار است گنجیدن در آغوشم
مرنج از دودۀ وصلی که با من در میان آرکا که خواهد شد بدوق دودۀ دیگر فراموشم

مخندم بہ بہار و روستائی شیعہ شمشادش زنگی چینان طرز جلوہ سرو قباہ کوشم
بیدل اپنے رنگ میں واحد اور بے مثل تھے جس کا اعتراف خود غالب نے کیا ہے:

ہمچنان کن محیط بی ساحل

متلزم فیض میرزا بیدل

ان کی پیروی کرنا اور ان کے طرز کو اپنانا کسی شخص کے بس کی بات نہ تھی، اس
یہ خود غالب نے کہا ہے:

رنگ بیدل میں ریختہ کہنا

اسد اللہ خاں قیامت ہے

یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ غالب بیدل کی پیروی سے گمراہ ہو گئے تھے بلکہ یہ کہنا
مناسب ہوگا کہ بیدل کے طرز کو اپنانا غالب کے لیے ممکن نہ تھا۔

غالب بھی سبک ہندی کے نائنڈہ اور پیچیدہ بیانی کے قائل تھے۔

سخن سادہ و لہجہ را نغز سبب غالب

نکتہ چہند ز پیچیدہ بیانی بمن آر

بہر حال غزل میں جو ان کا خاص میدان تھا، غالب نے عرفی، نظیری، ظہوری،
غالب آملی، اور حقیقی کی پیروی کی اور ان کو اپنا پیشوا مان کر ان کے سبک کو آگے بڑھانے
کی کوشش کی ہے۔ اپنے مرشدوں کے متعلق وہ اس طرح سے اظہار خیال کرتے ہیں:

”اگر پر طبیعت ابتدا سے نادر اور مزیدہ خیالات کی جو یا تھی،

لیکن آزاد روی کے سبب زیادہ تر ان لوگوں کی پیروی کرتا مل جو راہ

صواب سے نابلد تھے۔ آخر جب ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیشرو تھے

دیکھا کہ میں باوجود نیکہ ان کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں اور سپر

بے راہ ہمنگتا پھرتا ہوں، ان کو میرے حال پر رحم آیا اور انہوں نے

مجھ پر مرتبہ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی حقیقی نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو

جتلائی، طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور

مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ مجھ میں تھا اس کو فنا کر دیا۔ ظہوری
نے اپنے کلام کی گہرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر بند زاوراہ
باندھا اور نظیری نے خاص روش پر چلنا مجھ کو سکھایا۔ اب اس گروہ
والا شکوہ کی تربیت سے میرا ملک رقاس چال میں کبک ہے تو راگ
میں موسیقار۔

غالب نے بار بار ان شعرا کا ذکر اور ان کی پیروی کو اپنے لیے باعث
فخر سمجھا، نیز ان کے معرعوں کو اپنی غزلوں کا جز بنایا۔ اور ان کی غزلوں کے مقابلہ میں
غزلیں کہی ہیں۔ البتہ بعض اوقات شاعرانہ تعلیٰ کی وجہ سے اپنے کو ان سے بلند تر اور ارفع
ثابت کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ یہ جمل کہتے ہیں:

کیفیت عرفی طلب از طینت غالب
جام دگران بادہ ششیز از ندارد

گشتہ ام غالب طریت با مشرب عرفی کہ گفت
"روی دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است"

او جستہ جستہ غالب و من دستہ دستہ ام
عرفی کسی سمت یک نہ چوں من دریں پر بحث

چوں نشاند سخن از مرصع دہر بخویش
کہ برد عرفی و غالب بموضع باز و بد

ز فیض نطقِ خویشم با نظیری ہم زباں غالب
"چراغی را کہ دودی ہست در سر زود تر گیرد"

غالب ز تو آن باده که خود گفت نظیری "در کاسه ما باده مسجوشش نکودید"

ای ساخته غالب از نظیری باقطره ربای گوهر آور

غالب مذاق مانتوان یا مستن ز ما
رو شیوه نظیری و طرز حزی شناس

بعضی غمت نظیری وکیل غالب بس اگر توفشوی از نامه های راز چه حظ

غالب شنیده ام ز نظیری که گفته است نام ز جبرخ گزند بافتان خورم دریغ

غالب سوخته جان را چه به گفتار آری به یاری که نه داند نظیری ز قنیل

جواب خواجہ نظیری نوشته ام غالب خطا نموده ام و چشم آفرین دارم

بلد تازه گشته غالب روش نظیری از تو سزد اینچنین غزل را بسقیه ناز کردن

به نظم دشر مولانا پهلوری زنده ام غالب رگ جان کرده ام شیرازه او را بقیتا بشرح

ذوق لکر غالب را برده ز اینجمن بیرون پهلوری و صاحب محو همزانی با ست

نیاید هم زمن آنچه از پهلوری یا فتم غالب گر جاد و بیاناں را زمن واپستری باشد

غالب از جوش دم ما تر تشنگی پرش باد پرده ساز طہوری ما گل انشان کرد ایم

غالب از من شیوہ لعلی ظہوری نژد شد از لواخان در تن ساز بیانش کرد ام

غالب بشمر کم ز ظہوری نیم دلی عادل شہ سخن رس دریا نوال کو

زرت بردار ظہوری باش غالب صحت چیت در سخن درویشی باید نہ دکانداری

غالب ز وضع طاہم آید حیا کہ داشت چشمی بسوی بسیل و چشمی بسوی گل

غالب آیین حریق ست بہنوار ہنوز موج این بحر کرد بکند آمد و رفت

بدو بیتی ز گفتہای حسریں صفو را طرہٴ ایاس کنم

اندریں شیوہ گفتار کہ داری غالب گر ترقی کنم شیخ علی را مان

غالب نثر میں بھی ان شعرا سے استفادہ کرتے ہیں اور ان کے اشعار نقل کرتے ہیں، چنانچہ ایک جگہ امام بخش ناسخ کو لکھتے ہیں: آنچہ دریں چند روز از رنج و آشوب دیدہ ام، کافر ہاشم گر نگاہ کافر بعد سال موت بہنم یک نیمہ از ان تواند دید، چنانچہ عربی فرماید:

از بوی تلخ سوخت دماغ امید و یاس

زہری کہ در پیالہٴ ما کرو رو نگار

دوسری جگہ لکھتے ہیں: ”سرگزشت جوش و خروش پالانی کہ در غلوت غم می زند
شنید نیست، و بہ نگاہ رگ پشی کہ پروانہ را در بال دہراست برق شوق ہستی نشان

کہ در نہاد دل دارد دیدنی چنانکہ انہما کی آرزوی مقدمات و اہم ہای آبروی تاخرین
شیخ علی حزین سلیہ خرد:

شعبہ ام از صدق بخاک شہدا

تا دل دیدہ خونابر فشانم دادند

غالب نے ان پیشرو شعرا کے کلام کو سامنے رکھ کر ان کی غزلوں پر غزلیں کہی
ہیں۔ اب یہاں دو دو شاعروں کی ہم طرح اور ہم رویت و قافیہ غزلوں کے اشار
نقل کرتے ہیں، جس سے پتہ چل سکے گا کہ غالب نے کہاں تک تقلید اور کہاں اپنی جد
کو سامنے رکھا ہے:

عربی

دروی کہ با ناز دافسوں رود از دل صد شعبہ انگیز کہ بیرون رود از دل

غالب

راہست کہ در دل فدا خون رود از دل

ناید زبان شکوہ و بیرون رود از دل

عربی

خیز و شراب حیرتم زان قد جلوه سازد روی بروی کس دست بست سازد

غالب

مزنفا فراغ را مژدہ برگ د سازد سایہ بہر در گزار قطرہ بہر باز دہ

نظیری

آں کہ بر ما رقم کینہ زوا کینہ ما نقش آئینہ خود دیدہ در آئینہ ما

غالب

محکم نقش روی از درق سینہ ما اہی نکاہت الفت صیقل آئینہ ما

نظیری

کس نمود جرمای کہ جرم گزک خواست بے نکل رگفت کس کہ سنم نک خواست

غالب

هر چه فلک خواست ست به یکس از فلک خواست
ظرف نقیه بی نمک باد ما گزک خواست

نظیری

بموت اهل غرض قرب و بعد ما بندست دل شکسته مارا هزار پیوندست

غالب

چو صبح من ز سیاهی بشار ماخندست چگوئیم که ز شب چند رفت یا چندست

نظیری

نظر بظاهر و متباد در قفا خفتست اجل رسیده چه دانند بالا کجا خفتست

غالب

بصبح حشر چنین خسته رو سپه خیزد کرد شکایت درو غم دوا خفتست
در ازی شب و بیداری من این نیست ز بخت من خبر آرید تا کجا خفتست

نظیری

مبت با دل غم دیده الفت بیشتر گیرد چراغی را که دودی هست در سر زود تر گیرد

غالب

بمرض هر گستن کز نفس بالذبتابی خیالم الفت مرغور مویان را ز سر گیرد

نظیری

چشمش برای می رود و مرغان زناکش نگر در سینه دارد آتش پیر این چاکش نگر

غالب

در گریه از بس نازکی رخ لبه بناکش نگر دامن سینه بودن از پیش بر خاک زناکش نگر

نظیری

ز سطر اب ز غلغل گوش برون بر تاب ز ساقی از نخمه جام سسگران بر خیز

غالب

یقین عشق کن و از سرگمان بزمیزد آتش نبش یاب استمان بزمیزد

نظیری

دست کسی ز بسته و افسوس نکرده کس بستی تمام بده و محزون نکرده کس

غالب

تخی از نیام بیهوده بیرون نکرده کس براه هیچ کشته و ممنون نکرده کس

نظیری

بینه گریه گردش نقاب بر ترکش دل کباب مرز آتش درون برکش

غالب

بیا بباغ و نقاب از رخ چمن برکش دل بدود اگر خون شود در آذر کش

نظیری

اگر توفشوی از ناله های زار چه حظ دگر تو ننگری از چشم اشکبار چه حظ

غالب

مرا که باوه ندادم ز روزگار چه حظ ترک هست و نیا شامی، از بهار چه حظ

نظیری

رفیق برکنند در رو تو کام رفیق تراولی زغم آزاد، همو بیت عقیق

غالب

بگونه ای نه پذیرد ز همدگر تفریق تخی تو به دل بهومی بهام عشق

نظیری

نقش ویا چمن کشید نرنگ که زمین بود دانش و نرنگ

غالب

ای ترا دمل درین نرنگ دهن و چشم و دست و دل همه تنگ

ظهوری

من از تو حسابی شده مبر در چه حساب است
خورشید نه روشنی که چنین در تب و تاب است

غالب

هم دمه و هم منع ز نخشش چه حساب است
جان نیست کمر نتوان داد شراب است

ظهوری

دوش آن بی مبر خود رنجید و رنجیدن نداشت
بی زبانی عذر می گفت و بشتیدن نداشت

غالب

خواست گز ما رنجید و تقریب رنجیدن نداشت
جرم غیر از دوست پرسیدیم و پرسیدن نداشت

ظهوری

تا کجاست چینی سمن از مغز دماند
سرخسب عجز من و دمان نسیم است

غالب

ذوق طلبت جنبش اجزای بهار است
شور نفسم ریشه اعضای نسیم است

ظهوری

کی دست شان بیاید عیش می رود
آنها که خوب لذت نمهای او کنند

غالب

آنانکه وصل یار می آزد و کنند
باید که خویش را بگدازند و او کنند

ظهوری

بصارت تو مباد این ستم روا دارد
مباب پاکی چشم ترم کجا دارد

غالب

دماغ اہل فنانشہ بلا دارد بفرقہ ازہ طسوع پر ہما دارد

ظہوری

من و زکوی تو عزم سفر دروغ و دروغ کجا من و خیر این خبر دروغ و دروغ

غالب

اگر بہ مهر غولہ کی بنا ز خواہی کشت نہ بر چہ وعدہ کنی سحر دروغ و دروغ

ظہوری

کردہ نیلی سلی گبرگ من روی خزاں سیر خاطر کردہ یادش در بہار افتادہ ام

غالب

ہم بعالم نہ اہل عالم بر کنار افتادہ ام چوں از ہم سجدہ میردن از شمار افتادہ ام

جلالی چغتائی، استرآبادی (مقبول ۱۹۳۶ء/۱۵۲۹ء) کا دیوان ہندوستان

میں بہت مقبول ہوا اور کم از کم بارہ مرتبہ مطبع نول کشور سے چھپ کر شائع ہو چکا ہے غالب کے یہاں ان کا ذکر تو براہ راست شاید نہیں ہے، مگر اس بحر میں حسب ذیل ہم دیکھ سکتے ہیں:

جلالی

بشکر آنکہ شاہ مسند حسنی بعد عتبت مراں از خاک راو خود بخواری داد خواہی را
چو بیامدہ چہان تو خون کم می تو اس کردن چہ از بر لوطی ریزند خون بی گستاہی را

غالب

ہما بکونہ آموزان درس رمنی زاہد بذوق دعویٰ از بر کردہ بحث بے گناہی را

طالب اعلیٰ

بر حجتہ دلم زیں چہ من سبز جنبید آری اثر مہر در این آب و ہوا نیست

غالب

میانای می از تنیدی این می بگذارد پنجم غمت در خور تحول، مباح نیست

حزین

گوشی نشیدست صغیر از نفس ما چون شمع پر لب سوخت آید نفس ما

غالب

خوش وقت اسیری که برآمد بوس ما شد روز نخستین سبک گل نفس ما

حزین

ز داغ عشق چون نوشید زارم چیزش بی را
سر زولیده ام بر دراز میاں صامب کلای را

غالب

قضا آئینه دار مجز خواهد نازش بی را شگفتی در نهان دستی ادای کج کلای را

حزین

بک چون صبح زند دم ز صفا سینه ما صورت کین بر مهرست در آئینه ما

غالب

ممكن نقش دولی از ورق سینه ما ای نگاهت الع صیقل آئینه ما

حزین

ترجمی که مرا استخوان ز کاهش غم برنگ پنبه داغم ز آستین پیدا است

غالب

نگه بچشم نهان و ز جبهه بین پیدا است شگفتی تو زانده از مهر و کین پیدا است

حزین

در مانده سامان تهیدستی خویشم در دا که نگیرد ز عاشق دل و دهاں هیچ

غالب

ای من گر از راست زنجی خنجر هست ناز این همه یعنی چه کمر بکج و دهاں هیچ

حزین

خسرو بہا بہوایت دل مسکینم کرد گنج باد آور من خاک بر کوی تو بود
غالب

دوست دارم گر ہی را کہ بکارم زند اند کایں همانست کہ پیوستہ در ابروی تو بود

حزین

بی تو در پیرہن نامیہ خارست بہار چشمِ تمور ترا گر دو غبارست بہار
غالب

مژدہ ای ذوقِ خرابی کہ بہارست بہار خرد آشوب ترا از جلوہ یارست بہار

حزین

بی مطرب دی چشمِ تری را چہ کند کس پیانہ خونِ جگری را چہ کند کس
غالب

بگذاشت دل از نالہ گر اینہر بس نیست بہودہ امید اثری را چہ کند کس

حزین

چوں شمع مارا ہمزبانِ گرم سخن خواہد شدن
امشب عجب رنگارنگی در انجمن خواہد شدن

غالب

تا دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن این می از قحطِ خریداری کہن خواہد شدن

غالب کی بہت سی غزلیں ایسی طرحوں میں بھی ہیں جن میں ایک سے زائد شاعروں
نے طبع آزمائی کی ہے، اب ہم کچھ ایسی، بمطرح اور ہم روایت و قافیہ غزلیں نمونے کے طور پر
پیش کرتے ہیں، جن سے مختلف شعرا کے طرز فکر اور انداز بیان کے مقابلہ کرنے میں
آسانی ہوگی :

عرفی

تعمد ہم نگیر خاطر افکار ما سایہ گل بر شاہد گوشہ دستار ما

نظیرچی

طاعتِ مانیت غیر از ورش پندار ما بہت استغفار بہ محتاج استغفار ما

ظہوری

در بہت آنچہ می گوئیم اول می کنیم پارہٴ بیش است از گفتار ما کردار ما

غالب

گر بیانیست ناکاہ از درِ گلزار ما گل ز بالیدن رسد تا گوشہٴ دستار ما

ظہوری

صاف کوثر نمی از کودی پیامت ما جامِ خورشیدِ سفال در میخاست ما

حزین

داغِ سوداے تو دارد دلِ دیوانہٴ ما کعبہٴ لبیک زند بر درِ بختاست ما

غالب

لرزه دارد خطر از بیست ویران ما سیلِ راپای بہ سنگ آمدہ در خانہٴ ما

طالبِ احمدی

خدا یا بر سرِ ناز آرد با ما کج کلاہان را بہرِ غمخوار برافتن کن جادو نگاہان را

بیدل

اہنی پارہ اسی تمکینِ دمِ وحشی نگاہان را بقدرِ آرزویِ عاشقی کج کلاہان را

حزین

بلا شد گوشہٴ چشم تر تم بے گناہان را نگہِ بختِ سببِ تابت این مژگانِ بیابان را

غالب

توائی اللہ برمت شاد کردن بی گناہانِ نعلِ پند آردم کرم بی دستگانِ ان اس بحر میں بلائی اور غالب کے بھی کچھ ہم رویت وقافیہ شمر ذیل میں دیے

بارہ ہیں :

هلاکی

نهادی بر دلم دلخ فراق و سوختی جان را بدش و دردی چند سوزی در دمنده جان را

غالب

نویده انتات شوق و ادم از بلا جان را نکند جذبه طوفان شرم دم موج طوفان را

ظهوری

تاست بوسه روز جزا رفتست بپا خواهم لب چشش بنوازی شراب را

طالب آملی

شوقت فزود و مرتبه اضطراب را همچون پری بشیشه در آورد خواب را

غالب

سوزد ز بکه تاب جالش نقاب را و انم که در میان نه پند و محاب را

عرفی

دلم بقبله اسلام مائل افتاد است صنم تراش من از کفر نافل افتاد است

بیدل

مرا بآبک پاچه مشکل افتاد است که تا قدم زده ام پا به بر دل افتاد است

غالب

زمن گشتی و پیوند مشکل افتاد است مرا بگیر بخونی که در دل افتاد است

عرفی

هم سمندر باش و هم ماهی که در دریای عشق

روی دریا سبیل و تعمیر دریا آتش است

ظهوری

از هوای تفتنه دشت هجر و خاک آن پرس

تاثری خاکستر است و تاثر با آتش است

طالب اهل

خلق بکشايد مرا هر جا که گویا آتش است موی و تنم زبانم با آتش است

غالب

سینه بشودیم دغلقی دید کاینجا آتش است

بعد ازین گویند آتش را که گویا آتش است

حافظ

ز چشت جان نشاید بر دگر هر سو که می بینم
کین از گوشه ای که دست دیر اندر گمان دارد

ظهوری

دل خود را بنام فکر دردها و دواں دارد
مار کار و بار سود و سودا بر نیال دارد

طالب اهل

سرای دل از زخم زبان نغان دارد
که چشت تیر مزگان از نگه چندی زبان دارد

بیتل

پستی و انماند هر که از روی نشان دارد
سحر از پاکهای دل بگردون فرو بان دارد

نباید ضبط آه از دل بگزار تا شایست

که آنجا که همه آینه است آب روان دارد

نه پنداری جث بر دامن هر ذره می پیچیم
جهان را گرد بمنون محل ای گمان دارد

غالب

بنوقی سرزستی در قفا ے ره روان دارد

که پنداری کند یار همچون مار جان دارد

حرفی

این تشنگی به جام و مستراح کم نمی شود با ساقیان بگویی که فکر سبوح کنند

نظیری

آمد محرکه دیر و دم رفت و رو کنند تا بازم از نصیب چه خون در سبوح کنند

ز آن خم که زاهدان بقدر آب جو کنند شوریدگان موم می در سبوح کنند

ظهوری

رندان مسر حوصله سستی بهر بگو کنند چون پرده برفته در دیدن فرو کنند

غالب

آنانکه وصل یار همی آرزو کنند باید که خویش را بگدازند و او کنند

حزین

ساقی بگو چکیده دل در سبوح کنند تا صاف مشربان بخراپات رو کنند

بیدل

روشن دان چو آئینه بر هر چه رو کنند هم در طلسم خویش تماشای او کنند

نظیری

عشقست طلسمی که در و بام ندارد آئینس که از ویافت نشان نام دارد

غالب

نوسیدی با گردش ایام ندارد روزی که سپید شد سحر و شام ندارد

ظهوری

تغافل پیشه صید انگن این سرزمین شد که دایم بهر تقریبی بنگاهی در کین باشد

بیدل

محبت محو کرد از دل غبار و هم اسبابم به پیش شعله کی بر چهره و خاشاک چین باشد

بخود چیدن نایست بی انداز پردازی
کنند موج ما گریب نفس گرداب چین باشد

وداع سرکش کن گردلت راحت کمین باشد
چو آتش داغ شد جمعیتش نقش نگین باشد

غالب

ترا گویند عاشق آری چمنیست باشد
ز رشک غیر باید مردگر بر تو کین باشد
طالب آملی

صید آن گردش چشم کردل از کار برد
افسردت رباید دل بهشیار برد
حنین

قاصدی کو که پیامی بر دلدار برد
سوی گلشن خبر مرغ گرفتار برد
غالب

کو فنا تا همه آرایش زنگار برد
از صور جلو و از آئینه زنگار برد
طالب آملی

دل طرح بے دفائی گل پیش یار کرد
این حرف آشنا بدش منت کار کرد
حنین

دل بی جهت شکایتی از روزگار کرد
هر کار کرد یار فراموش کار کرد

هر خون که چرخ کرد چو مینا بکام من
بیرون ز دل بگریه بی اختیار کرد
غالب

از رشک کرد آنچه بمن روزگار کرد
در خشکی نشاء مرادید، خوار کرد
عراقی

نسیم عشق چو برگ سمن فرو ریزد
بگر ز ناله مرغ چمن فرو ریزد

حزین

چو سنبلی تو بطرب چمن سرو ریزد دل شکسته اش از هر شکن فرو ریزد

غالب

ترا که عالم نازی بنسزه بشاید کسی که گل بکنار چمن فرو ریزد

حافظ

قلب بی حاصل ما را بزن اکسیر مراد یعنی از خاک در دوست نشانی بمن آر

نظیری

اے مباد گل عطار نشانی بمن آر دزگلستان نشا پور حسنزانی بمن آر

غالب

ای دل از گلبن امید نشانی بمن آر نیست گر تازه گلی، بگ خزان بمن آر

نظیری

نالم ز چرخ گرنه با فغان خورم دریغ گریم بد هر اگر نه بطوفان خورم دریغ

حزین

رشک آیدش به نعمت من عالمی حسرت در روزگار بسکه بسان خورم دریغ

غالب

هنگام بوسه بلب جانان خورم دریغ در تشنگی چشمه حیوان خورم دریغ

حزین

از دست بگردد در چمن ای یوسف گل پیر من

دارد دل صد پاره ای هر غنچه پنهان در بنفل

بیدل

عریست چون گل میروم زین باغ حرمان در بنفل

از رنگ دامن بر کمر از بو گریبان در بنفل

غالب

دانش برمی در باغ خود را ز من نشاخته رخ در گنارم ساخته از شرم نہبان در غفل
تا پاس دارد خویش را می در گریبان رختی خستی چو رفتی زان میش گل از گریبان در غفل

اس روایت وقایع میں سب سے پہلی غزل قدسی مشہدی کی ہے (۱۶۴۶/۱۰۵۶ م)
جس کا مطلع یہاں پیش کیا جاتا ہے، غالب نے حتماً قدسی کی اس غزل کو بھی سامنے رکھا
ہوگا:

دارم دل اما چہ دل، صد گونہ حیران در غفل چشمی دہل در آستین اشکی دلوغان در غفل

عرف

تنہا دل تو خودی ناب شستہ ایم ناموس یک قبیلہ بدین آب شستہ ایم

نظیری

امروز آب دیدہ ندارد اثر کہ دوشش غمی گریہ را بشکر خواب شستہ ایم

غالب

شبہای غم کہ چہرہ بخواب شستہ ایم از دیدہ نقش دوسرے خواب شستہ ایم

نظیری

امال خویش بی سرو بی پانوشتہ ایم روزہ فراق را شب پیدا نوشتہ ایم

بیدل

رمز ازل کہ صدمہ آنسوی نظرت است پنہان نخواندہ اینہر پیدا نوشتہ ایم

غالب

تا نصل از حقیقت اشیا نوشتہ ایم آفاق را مرا دستِ عناق نوشتہ ایم

نظیری

ہمیشہ گریہ غمی در آستین دارم بنرخ زہر فروشم گرا بگبین دارم

ہالباکلی

منم کہ چشم و دل دعبہ آفرین دارم نیم سحاب و ترشح در آستین دارم

غالب

زمن حذر یکنی گر لباس دین دارم نہفتہ کافر مہبت در آستین دارم

نظیری

پرغوش است از دو کیدل سر حوت باز کردن

سمن گذشتہ گفتن گلاہ دراز کردن

حزین

سر راہ جلوہ ات را بعد آزدو گر فتن نگہ نیامندی بنف و نواز کردن

غالب

چہ غم از بعد گرفتگی زمن احتراز کردن نتوان گرفت از من بگذشتہ ناز کردن

عرفی

گر بدل خوش غنود می پر غمتی بی تو گر شاد بودی پر غمتی

ہالباکلی

ای کہ با فردی ہنر ہر سیم بی ہنری می فرود می پر غمتی

غالب

گرنہ نوا با سرود می پر غمتی مسک نیم گر بنود می پر غمتی

ظہوری

ای دل بجوش گرم تنہای کیستی عیشت ہلال ہست تماشا کیستی

حزین

بیام و بہ لعل تو در جان سپاریم برگو خدای را کہ مسیحی کیستی

ان شعرا کے علاوہ اس زمانے کے دوسرے بڑے بک ہندی کے شعرا بھی غالب

پر بہت زیادہ اثر انداز ہوئے ہیں مناسب کا نام پچھلے اشعار میں آچکا ہے۔

قدسی مشہدی بھی اپنے زمانے کے بڑے شعریں سے تھے۔ غالب نے ان کی غزل پر یہ قصہ لکھا ہے :

کیستم تا بخودش آورم از بے ادبی قدیاں پیش تو در موقع حاجت طلبی
رفتہ از خویش بدیں زمزمہ بواجبی مرحبا سید کئی مدنی المردلی
دل و جاں باد فدایت چہ عجب خوش تقی
غالب غمزہ رانیت دریں غمزہ لگی جز بامید و لای تو تمنا ہی بھی
از تب و تاب دل سوختہ غافل نشوی سیدی انت حبیبی و طیب قلبی
آمدہ سوی تو مستی ہی در مان طلبی

تمام بڑے صوفی شعرا کی طرح محمود شبستری (م ۱۳۲۰/۷۴۰) کی مثنوی گلشن راز نے بھی غالب پر گہرا اثر ڈالا ہے، چنانچہ دیا پر توہ سخن میں ایک جگہ کہتے ہیں :

ایں سوز و ساز خداوند گلشن راز فرماید، بیت :

ہر آنکس را کہ اندر دل شکی نیست یقین دان کہ ہستی جز ہی نیست

غزل کے بعد غالب کا دوسرا بڑا میدان قصیدہ ہے، جس میں انھوں نے انوری (م ۸۸۲/۵۸۲ - ۱۱۸۴) خاقانی (م ۵۹۵/۹۹ - ۱۱۹۸) اور عراقی کی خاص طور سے پیروی کی ہے، نیز ان کے قصیدوں کو سامنے رکھ کر قصیدے کہے ہیں۔ اب ہم ان کے قصیدوں کے مطلقوں کو ان کے پیش رو شعرا کے مطلقوں کے ساتھ پیش کرتے ہیں، انوری :

زبان پس کہ تضا شکل و گر در جہاں را وز خاک برون کہ وقہ امن اسان را
صبا بسوزہ بیدار است وار دنیا را نمود گشت جہان مرغزار عقیلی را

شہر و فتنہ و پر مشغلہ و پر غوغاست تید و صحر جہاں بازند است کجاست

بلکہ دعوی زنج و گواہی تقویم شب چہارم ذی حجہ سہ تاہم

ای قصه کرده دین خدا از مکان تو دی پشت ملک روی جهان آستان تو

اے شمس دین شمس فلک آستان تو اے صدر ملک و صدر جهان آستان تو
غالب

چوں تازه گنم در سخن آئین بیان را آواز دهم شیوه ربا همفغان را

دی که گشت تو امید ی تماشا را سپیده سحری غازه روی دنیا را

دوش در عالم منی که صورت بالاست عقل فغان سراپده زود بزم آراست

درین زمانه که کلک رعد نگار حکیم هزار و دوصد و پنجاه راند در تقویم

اے برتر از سپهر بلند آستان تو تو پاسبان ملک، ملک پاسبان تو
خاقانی

شب روان چون رخ صبح آئند سیمابیند کعبه را چهره در آن آئینه پیدا بینند

هر صبح سر ز گلشن سودا بر آورم وز صوبه آه بر فلک آوا بر آورم

نثار اشک من هر دم شکر در لیست پنهانی که بهت را ز ناشوئیت از زانو پیشانی
غالب

ره روان چوں گهر آبله پا بینند پای را پای فراتر ز ثنیا بینند

خواهم که بهوں ناله ز دل سر بر آورم دود از خود و شراره ز آذر بر آورم

بهر کس شیوه خامی در ایشاست ارزانی زمن مدح و زلار دژ آن برا گنجینه افشانی
زهر گلی که هوای دلم نقاب کشاد ^{عقی} فلک بگشاید حسرت نوشت و داد بپاد

عشق کوتا حسرد بر اندازد عود شوقی ب بحر اندازد

آمد آشفته بخوابم شبی آن مایه ناز بروش مهر فرا و بنگه صبر گداز

رفتم ای غم ز پی عمر شتابان رفتم بشاب اطلبت هست زمن بان رفتم

باز گلبانگ بر ایشان می زدم آتشی در عنایب میسزدم

ای متابع دد در بازار جان انداخته گوهر هر سود در جیب زیان انداخته

ز خود گردیده بر بندی بر آنم کام جان بینی اهلن کز اشتیاق دیدش زاری همان بینی

بیا که بادم آن می کند پریشانی که غزه تو نکردست با مسلمان

دی که لشکر غم صفت کشد بخو خزاری دلم بناله دید منصف علم داری

مگر مراد دل کامر بود شب میلاد ^{غالب} که ظلمتش دهد از گوهر ابله میان یاد

داد کوتا ستم بر اندازد طرح تو چه رخ دیگر اندازد

یافت آئینہ بخت تو دولت پرداز ہر کلمتہ بدین حسن خدا سزاوار

گر بہ سبیل کدو روضہ رضوان رستم ہوس زلفت ترا سلسلہ جنیان رستم

زخمہ بر تارِ رگب جان می زخم کس چہ داند تاحپہ داستان می زخم

ای زوہم غیر غوغا در جہاں انداختہ گفتہ خود حرفی و خود را در گماں انداختہ

بیادہ کر بلا تا آن تنگش کارواں بینی کہ دروی آدم آل عبا را ساربان بینی

نغان کز نیست سود برگ دامن افشانی بہ بند خویش فروماندہ ام ز عسائی

مرادے است پس کوچہ گرفتاری کشادہ روی ترا ز شاہان بازی

کچھ طرحیں ایسی بھی ہیں جن میں دو سے زائد شاعروں نے قصیدے کہے ہیں اب ہم ذیل میں ایسے ہم طرح اور ہم قافیہ و ردیف قصیدوں کے صرف مطلعوں کو نقل کر رہے ہیں :

النور

ای مشاہدہ تازہ ز دست تو کرم را

عسائی

اقبال کرم می گزدار باب ہم را بہمت نخورد نیشتر لا و ضم را

غالت

آوارہ غریب نتواں دید صنم را ای ذات تو جامع صفت عدل و کرم را

النورثی

دوش از درم در آمد سر مست و بقرار همچون مرد و هفت و هفت کرد و پار

جبل متین ملک دوتا کرد کردگار اقبال را بوعده دنا کرد روزگار

عربی

تا بازم از دصال جدا کرد روزگار بارزگار شوق چها کرد روزگار

غالب

شادم که گردشی بسزا کرد روزگار بی باده کام عیش روا کرد روزگار

گید آورد بشکل فرس باد را بهار تا شیو دعیان سنگه بپاید شود سوار

النورثی

رئیس مشرق و مغرب ضیاء دین منصور که هست مشرق و مغرب ز عدل او منصور

عربی

سپیده دم چو دم آستین بشع شعور شنیدم آیت لا تقنطوا از عالم نور

غالب

تجلی که ز موسی ربود هوش بطیر بشکل کلب علی خاں و گر نمود ظهور

النورثی

جرم خورشید چو از حوت در آید بحمل اشپ روزگنا و هم شب را از حل

عربی

چهره پرواز جهان رخت کشد چون بحمل شب شود نیم رخ در روز شود مستقبل

غالب

وقت آنست که خورشید فروزان ایکن گرده آینه گراینده بفرگاه حمل

خاقانی

مجدد چوں کہ بند آہ درد آسای من چوں شفق در خون نشیند چشم بپای من

عرفی

مجدد چون در مدول صور شیون زای من آسمان صبح قیامت گرد و غوغای من

غالب

زاں نمی ترسم کہ گردد قعر دوزخ بای من دای گر باشد بهیں امروز من فردای من

النوحی

سپاس ایند کاند رمضان دولت و جاہ بکام باز رسیدی بصد بر مسند و گاہ

عرفی

ز تپ شش مهر سایہ بہر پناہ سزد کہ بگسلد از شخص و پیش گیر دراہ

غالب

زوی ز خویش نشان کمال صبح اب سراج دین نمی بو ظفر بہادر شاہ

غالب کے زمانے تک آتے آتے قصیدہ اور غزل میں فرق کم ہوتا گیا۔ غالب نے اپنے بعض قصیدوں کو غزل کہہ کر یاد کیا ہے۔ جیسے کہتے ہیں :

خود فرد خون و بگفتار شناسانِ خدای کیں غزل زمرئہ بلبلستانِ من ست

نشوم صوبِ مزا میر و ضرورتِ سماع لاجرم خامہ بگبانگِ غزل پردہ است

رازد دلِ سودا زده در سینہ نہ گنبد اندیشہ باہنگِ غزل پردہ درآمد

بنم ترانہ غزلی کایں نواہی شوق دل را نوید زندگی جاوداں دہ

غالب قصیدہ را بشمار غزل در آور و از شہ بریں غزل رقم انتخاب خواہ

بر ساز دل نوازی تمحیص خسروی ای خسروی نوا غزل از بر گرفته ایم

دادہ در توحیدم آئین غزل گفتن بیاد ای ہم از گفتار بندم بر زبان انداختہ

غالب نے ہر صنف سخن میں کمال دکھلایا ہے۔ ان کی مشنویاں بھی اہمیت کی حامل ہیں جن میں انھوں نے نظامی گنجوی (د م ۹۰۳ / ۱۲۰۴) مولانا جلال الدین رومی (د م ۶۷۲ / ۱۲۷۳) زلالی (د م ۱۰۱۳ / ۱۶۱۵) وغیرہ کی پیروی کی ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

نظامی نیم کز خضر در خیال بیاموزم آئین سحر حلال

زلالی نیم کز نظامی بخواب بگلزار دانش برم جوی آب

غزل را چو از من نوائی رسید ز دلا پسچی بھائی رسید

نباشم گر از گنجہ، گنجم بس ست بغم گر چنینی پردہ بنجم بس ست

دستبنو میں ایک جگہ رقم طراز ہیں : " دانش گنجور گنجہ از زبان من ہی گوید "

پہ نیک وچہ بد در جہان می رود

ندامتم کہ گیتی چسان می رود

اب یہاں ہم در ایسی ہم طرح مشنویوں کو ساتھ ساتھ پیش کرتے ہیں :

نظامی گنجوی

نزدن الاسرار

بسم الله الرحمن الرحيم هست کلید در عین حکیم
غالب

درد و داغ

بی ثمری بزم گرمی پیشه داشت در دل محرابی جنون ریشه داشت
رنگ دبو

بود جوان دوستی از خردوان غازه کشر عارض مند و ستان
تهنیت میدشوال

باز برانم که بدیباي راز از اثر تاطقه بندم طراز
نظامی

غیر و دشیری

هنداوند در توفیق بخشای نظامی را در تحقیق بنمای
مثنوی زلالی

بنام آنکه آموزش ایاز است نفس بتواند ناز و نیاز است
غالب

چرخ دیر

نفس با سوز و ساز است امروز خموشی مشر را ز دست امروز
دیباچه نشر موسوم بر بخت و هفت (نسر) شاه اورد

بنام ایند زهی محمود راز شگفت آور تو از نیرنگ اهاز
نظامی

بخت پیکر

انی جهان دیده بود خویش از تو پنج بودی نبوده پیش از تو

غالب

باد مخالفت

ای تماشاخانه بزم سخن دی سیما دامن ناور فن
مشنوی

بدان ای دقیت اندیشان حق پرستان و معدلت کیشان
نظامی

شرف نام (اسکندر نام)

خدایا جهان پادشاهی تراست زما خدمت آید خدای تراست
غالب

ابرگهر باد

سیاهی کز تو نام نامی شود سخن در گزارش گرامی شود
مشنوی

درین سال نواب عالی جناب بروی زمین غیرت آفتاب
نار منکوم بنام جوهر

دفا جوهر از تو عنم دور باد دلت سرخوش باد سور باد
مولانا جلال الدین رومی

بشنو ازنی چون ملکیت می کند در جدائیها شکایت می کند
سرربینش

من نیم کز خود حکایت می کنم از دم مری روایت می کنم
تقریظ آئین اکبری

مژده یاران را که این دیرین کتاب یافت از اقبال سید فتح باب
ترجمه دعا و الصباح

ای خدا ای داور کو بر کشاد از درخشیدن زبان کامداد

آغاز مجرب مناجات امام زین العابدین

یا الہی قلب من محبوب و تنگ
عقل من مطلوب و نفس من بہ ننگ

مشنویوں میں سب سے زیادہ قابلِ توجہ وہ مشنوی ہے جس میں غالب نے سرسید احمد کی تصحیح کردہ آئین اکبری پر تقریظ کی ہے۔ سرسید احمد اور غالب دونوں نے نئی مغربی تہذیب کا استقبال کیا ہے۔ غالب بلاشبہ بہت بڑے شاعر تھے مگر یہ ہنر سرسید کو حاصل نہ تھا، مگر اسی کے ساتھ ساتھ کہنا پڑے گا کہ سرسید کی نظر و شعرو شاعری کے الہامی ہنر کو چھوڑ کر غالب سے زیادہ وسیع اور عمیق تھی۔ ابو الفضل کی عظمت کو نہ سمجھنا، اس سے خود غالب کی کوتاہی کا پتہ چلتا ہے۔ نیز اسی مشنوی کے ابیات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ نئی قدروں سے اس قدر مرعوب ہو گئے تھے کہ پرانی تہذیب اور قدروں کو باقی رکھنے یا اس کی تقدیر و قیمت کو پرکھنے اور سمجھنے کے لیے تیار نہ تھے، فرماتے ہیں :

ہیں کہ در تصحیح آئین رای اوست ننگ دمار بہمت والا ی اوست

کس عز باشد بر گیتی ایں ستار خواجہ راجہ بود امید ارتفاع

گر ز آئین می رود پاس سخن چشم بکشا و اندرین دیر کہن
سایبان انگلستان را نگر شیوہ و انداز ایمان را نگر
تاچہ آئینہا پدید آورده اند آنچه ہرگز کس ندید آورده اند

یہاں ہم آئین اکبری کے سبک و در طرز نگارش کے متعلق ذیل میں صرف ملک اشرا بہار کے خیالات اور الفاظ کے نقل پر کفایت کرتے ہیں۔ نیز اس سے عسلائی (ابو الفضل کی عظمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے :

”شروع تہذیب نثری در ہندوستان“

در ہندوستان فضلا بقص و قنادی فارسی ہی برزند و قدیم ترین کسی کہ ہا میں
عیب متوجہ گردید و در صد و اصلاح زبان برآمد و دی بود فوق العادہ موسوم بہ شیخ
ابوالفضل

ابوالفضل قدیم ترین کسی است کہ در محل و فهم لغات وری سہی کرد و ...
بر آن شد کہ تا بتواند الفاظ عربی را از فارسی بیرون کشیدہ بجای لغات مذکور از لغات
وری بگذارد ... و ... بہ تفسیر سبک فارسی آغاز کرد و همان کاری را کہ در اواخر
عہد محمد شاہ قاجار ابتدا شدہ و امروز بسیلہ فضلای ایران بر تہذیب واقعی و عقلانی آن
یعنی قیام در تکیان دادن زبان فارسی از لغات بی موجب و ذلیل رسیدہ است
در پیش گرفت۔

... آئین اکبری و در دائرۃ المعارف ہندوستان اس عصر ... یکی از لغات کتب
فارسی است ... و با آنکہ قعدی در نیا در دن و حذف لغات عربی بعض جا ہلانہ ...
بخرج نمی داد، معہذا بعض عبارات او بفارسی خالص است۔ و در نشر اول لغات عربی
کہ صدی ہشتاد و ہشتاوی کتب را گرفتہ بود بعدی وہ دوازده لغت تنزل کرد ...

یہاں یہ بھی یاد رکھنے کی چیز ہے کہ ابوالفضل منٹل تہذیب کے عروج کی پیداوار
ہیں، جب کہ غالب اس کے انحطاط اور مغربی تہذیب کے آغاز کے سنگم میں جنم لیتے ہیں۔
غالب کے سامنے فارسی ادب کی ہزار سار روایت موجود تھی جس سے انھوں نے
پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ مگر اس کے ساتھ وہ جس صدی کی پیداوار تھے، اس سے بھی استفادہ
کرتے رہے۔ نیز انھوں نے ایک نئے جہان لفظ و معنی کو جنم دیا۔ ان کے یہاں شگفتگی،
خیالات کی رنگارنگی، ترکیبوں، تشبیہوں اور استعاروں کی ندرت اور تازگی، گزشتہ
اساتذہ سخن سے بڑی حد تک الگ اور بعض مقامات پر ان سے آگے ہے۔ ان کے کلام
میں آمد ہے، آواز نہیں۔ ان کی ایک خاص استیازی خصوصیت ان کا اپنا "انداز بیان"

ہے۔

غالب کے یہاں تصوف کے مضامین بھی بکثرت ملتے ہیں اور وہ روح تصوف سے

پوری طرح آشنا تھے مگر اسی کے ساتھ ہوس ہستی کو بھی انہوں نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

غالب غزل، قصیدہ، مثنوی، سبھی مشہور اصنافِ سخن میں ایک منفرد رنگ کے مالک تھے۔ نیز ان کی روشِ ادب اور اندازِ دوسرے سے الگ ہے۔ ان کے فکر کی پرواز، الفاظ اور ترکیبوں کی بندش نگاہِ نظر کو اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے۔ کھنگلی اور پرانی روایت کے برخلاف، ان کے یہاں تازگی اور نئی دنیا کا ہر تپاک استقبال دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے کہتے فکر و خیال اور ادب کے بجائے، نیا رنگ اور نئی فضا پیدا کی ہے جیسا کہ خود کہتے ہیں :

رفتم کہ کھنگلی ز تماشا برانگنم
در بزم رنگ و بو غملی دیگر انگنم

البتہ وہ آسان طرزِ ادب کو اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتے تھے اور پچیدگی اور حلق کو اپنی شاعری کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ فارسی شعر و نظم میں وہ اسی انداز پر باقی رہے۔ مگر اس کے برعکس اردو شعر و نظم میں انہوں نے ایک انقلاب برپا کر دیا اور ان کی عظیم شہرت کا باعث وہ اردو کی غزلیں ہیں، جو ابتلائی سادہ، رواں، جذبات سے پُر اور دل و جگر میں چبھنے والی ہیں۔

آخر میں اتنا اور کہہ دیا جائے کہ فارسی شاعری کی روایت اتنی عظیم، شاندار و وسیع اور تاریخی ہے کہ غالب جیسی شخصیتیں اس میں گم ہو جاتی ہیں۔ اردو زبان و ادب کے غالب وہ نہیں ہیں جو فارسی میں نظر آتے ہیں۔ نیز وہ شاہِ کارِ کلام جو اردو ادب کی تاریخ کا سب سے زیادہ نمایاں محنت ہے، فارسی میں اس کی کمی محسوس ہوتی ہے۔

حواشی

۱۔ سبک شناسی، جلد اول، مقدمہ صفر ز، ی، یا، تہران، ۱۳۳۱ شمسی

- ۲۔ دانش سرای عالی، تہران، شمارہ ۴۳، ۱۳۵۰ شمسی
- ۳۔ قدیم زمانے میں جنوب ایران کو عراق کہتے ہیں، بعد میں عراق، عجم اور عراق عرب کی اصطلاح پیدا ہوئی تاکہ دونوں عراقوں میں امتیاز ہو سکے۔
- ۴۔ دیوان غالب، مخطوط نمبر ۱۹۹۸، ۶۲۰، نیشنل میوزیم، نئی دہلی۔
- ۵۔ حافظ اور اقبال، غالب اکینہی، نئی دہلی، ۱۹۷۶ء ص ۱۲
- ۶۔ کلیات نثر غالب (تقریباً دیوان خواجہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ) مطبع نوکلشور، ۶۱۸۶۸/۱۳۸۳ء ص ۳۷
- ۷۔ الطاف حسین حالی: یادگار غالب، شانتی پریس الہ آباد، ۱۹۵۸ء ص ۵۶
- ۸۔ کلیات غالب نامہ مرتبہ میر حسن نوری راجہ رام کمار پریس لکھنؤ، فروری ۱۹۶۸ء، ص ۹
- ۹۔ یادگار غالب ص ۱۵۵
- ۱۰۔ کلیات نثر غالب، ناول کشور ۱۸۶۸ء، آہنگ پنجم (در مسابقات کہ بہ اختتام رسید تحریر یافت)
- ۱۱۔ ایضاً آہنگ پہرام، دیباچہ دیوان فارسی، ص ۲۶
- ۱۲۔ ایک مرتبہ ۱۸۸۳ء میں چھپا تھا مگر یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس سال پہلی مرتبہ چھپا تھا یا اس سے قبل بھی شائع ہوا تھا۔
- ۱۳۔ کلیات غالب (نورانی) دیباچہ، ص ۲۸
- ۱۴۔ دستنبو، بمبئی، ۱۹۶۹ء (صد سالہ یادگار غالب کمیٹی) ص ۲۶
- ۱۵۔ سبک ہندی، جلد سوم ص ۹۱-۲۹۰

غالب حالی شیفۃ اور ہم

شرقی دنیا میں نطق کا سکہ نہیں پلتا۔ شعر یا شاعر کی پسند اور ناپسند میں کسی دلیل کو دخل نہیں۔ اس کا معاملہ بالکل کسی پر دل آنے کی طرح ہوتا ہے، جس کے لیے بقول تیر: اس میں بے اختیار ہیں ہم بھی۔ ہر کسی کی پسند مختلف ہوتی ہے۔ اگر ایک شخص کو کسی شے یا شخص میں حسن نظر آتا ہے، تو دوسرا اس کے بالکل برعکس دیکھتا ہے۔ بے یوں کر دیکھنے والا اپنا حسن نظر اپنے مطلوب اور محبوب میں منتقل کرنا ہوتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بارش و بہار میں آپ کو یوسف اور اس کی کرپہ صورت کنیز کے ساتھ کی داستان سنہ ملتے۔ اسی لیے کہتے ہیں: بلی را بچشم مجنوں باید دید۔ حسن انسانی کی اس پسند و ناپسند کو شعر پر بھی منطبق کیا جاسکتا ہے۔ ایک واقعہ سنئے: کوئی بیس سال پہلے جب راقم ایم اے کا طالب علم تھا، نیاز فتح پوری مرحوم دہلی یونیورسٹی میں تشریف لائے تھے اور دہلی کے تین بڑے شاعروں ذوق، مومن اور غالب پر ایک لیکچر دیا یا یوں کہیے کہ پیر چٹھا تھا۔ انھوں نے ذوق اور غالب کے کلام کی بہت تعریف کی، کئی محاسن گنائے لیکن آخر میں فرمایا: یہ سب بھی، لیکن اگر آپ میرے سامنے مومن کا یہ شعر پڑھیں گے:

جی نہ کہا وصلِ عدو سچ ہی ہو گیا کروں جب گلہ کرتا ہوں ہدم، وہ قسم کھا جائے ہے

تو میں بے شکلف مومن کا دیوان اٹھاؤں گا۔ دیکھا آپ نے! محض ایک شعر نے نیاز صاحب کو مومن کا نیاز مند بنا دیا۔ دنیاے شعر میں یہ واحد مثال نہیں ہے۔ غالب کے لیے بھی تو کہنا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا: کاش مومن خاں میر اسرار دیوان لے لیتا اور اپنا یہ شہر بچھ دے دیتا:

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا

جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو ما اس تمہید طرازی کا انتخاب کر محض ایک شعر کی بنیاد پر بھی کوئی آپ کا میر دیا پسندیدہ شاعر ہو سکتا ہے اور آپ کے دل میں گھر کر سکتا ہے۔ میر اور غالب مصطفیٰ خاں شیفۃ کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ تو شیک یاد نہیں کب، لیکن بہت پہلے سنا تھا:

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفۃ

اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

اور شعر کے ساتھ شاعر نے بھی دل میں گھر کر لیا تھا۔ مجھے یہ اعتراف کر لینے میں کوئی باک نہیں کہ بعد کے زمانے میں بھی میں نے شیفۃ کا کچھ زیادہ مطالعہ نہیں کیا۔ لیکن جو دستور بہت مطالعہ کیا اس سے شیفۃ کا وہ مقام بدستور رہا جو ان کے مذکورہ شعر نے میر کے دل میں بنالیا تھا۔

پھر وہ زمانہ آیا جب ہم نے تعلیم کی کچھ اور منزلیں طے کر لیں اور غالب ہمارے میر و بن گئے۔ غالب سے اپنے تعلق کے باب میں صرف اتنا ہی کہنا کافی ہو گا کہ تیرے انتہائی محبت و عقیدت کے باوجود ہم نے بشمول تیرے کسی اور شاعر کا دیوان اتنی بار نہیں پڑھا جتنی بار غالب کا دیوان پڑھا اور ہمیں کسی دوسرے شاعر کے اتنے شعر یاد نہیں جتنے غالب کے۔ بہر حال جب کسی سے محبت ہو جائے تو اس کی ہر بات وہی معلوم ہوتی ہے۔ چنانچہ جب غالب کا یہ شعر نظر سے گزرا،

غالب پر فتنہ گفتگو نازدہیں ارزش کہ او

ز لولہ در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش بخورد

تو نہ صرف یہ کہ شیفۃ سے تعلق میں کچھ اور استواری پیدا ہوئی بلکہ ان کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی سامنے آیا یعنی شیفۃ کی سخن فہمی۔

غالب آپ کا محبوب شاعر ہو، آپ اس کی ہر تحریر پڑھیں اور اس پر لکھی ہوئی دوسروں کی تحریریں نہ پڑھیں، یہ ممکن نہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ہماری شناسائی مولانا حالی سے ہوئی۔ مولانا اول تو غالب کے عزیز شاگرد اور عزیز کا عزیز بھی ہوئے ہیں، دوسرے وہ نہ صرف غالب کی عظمت کو نمایاں کرنے والے تھے بلکہ قصر تنقید کی خشتِ اول بھی انھیں کے اٹھوٹا رکھی گئی تھی۔ ہماری شاعری کو نیا سوز دینے والوں میں بھی وہ پیش پیش تھے۔ اسی سبب سے شیفۃ کے تربیت یافتہ، ان کی صحبت اٹھائے ہوئے۔ لہذا ان سے ہماری قرابت دو گونہ ہوئی۔ اس خارج ان کا حرفِ حرت ہمارے لیے مستند و معتبر ٹھہرا۔ چنانچہ جب انھوں نے فرمایا:

مائی سخن میں شیفۃ سے مستفیض ہوں

شاگرد میرزا ہوں متقلد ہوں میر کا

تو شیفۃ سے ہماری شیننگلی کچھ اور بڑھ گئی۔ پھر جب مولانا کا یہ بیان پڑھا:

• نواب محمد مصطفیٰ خاں مرحوم جو فارسی میں مہارتی اور اردو میں شیفۃ تخلص کرتے تھے، اگرچہ مرزا کے تلامذہ میں شمار نہیں ہوتے تھے بلکہ جب تک موتن خاں مرحوم زندہ رہے، انھیں سے مشورہ سمن کرتے تھے لیکن حناں موصوف کی وفات کے بعد ریختہ اور فارسی دونوں زبانوں میں وہ برابر مرزا کو اپنا کلام دکھاتے تھے اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو مرزا کے بعد ان کے مسامرہ میں کسی کی فارسی کی علیٰ ان کی فارسی غزل سے لگا نہیں کھاتی تھی۔ اور شعر کا جیسا صحیح مذاق ان کی طبیعت میں پیدا کیا گیا تھا ویسا بہت ہی کم دیکھنے میں آیا ہے۔ لوگ ان کے مذاق کو شعر کے حسن و قبح کا سمیاد جانتے تھے ان کے سکوت سے شاعر کا شعر خود اس کی نظر سے گر جاتا تھا اور ان کی تحسین سے اس کی قدر بڑھ جاتی تھی۔ یہاں وہ شخص تھے جن کی نسبت مرزا فرماتے ہیں: غالب بہ فن گفتگو ...

تو ذمہ شیعہ سے عقیدت میں اضافہ ہوا بلکہ ان کے صحیح مذاق شعر اور نفاذ اسے حیثیت کا نقش بھی دل پر بیٹھ گیا۔ اس میں بچگی ان بزرگوں کی آرا سے پیدا کی جن کی کتابیں ہر طالب علم کے لیے سند بلکہ صیغے کا حکم رکھتی ہیں، مثلاً۔

۱۔ "شیعہ پر نسبت شاعر کے نفاذ کی حیثیت سے زیادہ مشہور ہیں۔" اپنے زمانے

میں بھی ان کو یہی شہرت حاصل تھی۔ ان کا تذکرہ گلشن بے غار ایک مبسوط اور

مشہور تصنیف ہے اور ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انستا

اور کزاوی کے ساتھ اشعار کی تنقید کی گئی ہے۔۔۔ نواب صاحب کی سخن فہمی

کی اتنی شہرت تھی کہ غالب ایسا صاحب کمال اپنے اشعار کی اچھائی برائی

کی کسوٹی نواب صاحب کی پسندیدگی کو قرار دیتا ہے۔ (رام بابو سکینہ)

۲۔ "اس زمانے میں نواب صاحب کی سخن گوئی سے زیادہ ان کی سخن فہمی کی حریم

تھی۔ مرزا نوشہ تک ان کی سخن فہمی کے معترف و مداح تھے۔ مرزا کے نزدیک

نواب کی پسند شعر کے حسن و قبح کا معیار تھا۔" (حکیم عبدالحی)

۳۔ "ان کی سخن فہمی کا ثبوت ان کا مشہور تذکرہ گلشن بے غار ہے جس میں ہر

شاعر کے کلام کے متعلق انھوں نے بڑی چھٹی رائیں لکھی ہیں۔ خود ان کے

معاصرین ان کے مذاق سخن کے معترف و مداح تھے۔ غالب کہتے ہیں۔ غالب

پر فن گفتگو... الم" (نور الحسن ہاشمی)

۴۔ "میرے نزدیک جو رائے اردو شعر کے کلام کی نسبت آپ نے ظاہر فرمائی اگرچہ

وہ مختصر ہے لیکن نہایت چھٹی تھی ہے۔ ہم کو تو شیعہ صاحب مرحوم کی آراء و

رائے دیکھ کر بے حد مسرت ہوتی ہے۔ آپ کی رائے اگرچہ بے لاگ ہوتی ہے

لیکن مختصر۔۔۔" (محمد یحییٰ تہس)

۵۔ "شیعہ آخری دور کے بہترین نقاد ان سخن میں شمار ہوتے ہیں۔ ادبی اور فنی

نقطہ نظر سے شیعہ کی رائے عموماً درست ہوتی ہے۔" (ڈاکٹر سید عبد اللہ)

۶۔ "پرانے تذکرہ نگاروں میں شیعہ بڑے مقرر اور منصف مزاج واقع ہوئے ہیں۔"

(بھٹوں گو کہ پوری)

۷۔ "متاخرین کے تذکروں میں جس تذکرے کو بڑی اہمیت حاصل ہے وہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا گلشن ہے۔... ان کے ذوق کی بلندی کے غالب اور حالی تک معرّت ہیں۔... گلشن بے غار کا پتہ تنقیدی اعتبار سے ہماری ہی کیوں کر شیفتہ بڑے سے بڑے شاعر کے مطلق بھی صحیح رائے دینے اور اس کا خیال کو اہلگو کرنے سے باز نہیں آئے۔... ان کی نظر میں دست، گہرائی اور وقت ہے۔ عام خیال سے وہ متاثر نہیں ہوتا بلکہ اپنی رائے آنادہ سے قائم کرتا ہے۔ مجبوری اعتبار سے اگر شیفتہ کے تذکرے کو دیکھا جائے تو اس میں نہایت سوچی سمجھی رائیں ملتی ہیں اور صحیح قسم کی تنقید کا پتا چلتا ہے۔"

(ڈاکٹر عبادت بڑیلوی)

۸۔ "اس تذکرے میں جو متانت اور وزن پایا جاتا ہے وہ اور تذکروں میں مشکل سے ملتا ہے۔ شیفتہ ناقد بھی بہتر ہیں اور شاعر کے بارے میں ان کی رائیں خاں اہمیت رکھتی ہیں۔... (ان کے یہاں) تنقید کا پہلو زیادہ جاندار، زیادہ نمایاں اور زیادہ صحیح ہے۔... مولعت کو اپنے فرض کا احساس ہے اور اس نے ذاتی تعلقات سے متاثر ہو کر شاعر کے کلام کی تعریف نہیں کی ہے؟"

(پرنسپل عبدالشکور)

ان اقوال زیریں "پر سر دست کسی جعرے کی ضرورت نہیں، البتہ دو ایک باتیں ذہن نشین کر لیجیے: (۱) یہ سب اقوال ایک دوسرے سے متاثر و ماخوذ ہیں۔ (ب) سب بزرگوں نے شیفتہ کی تنقیدی حیثیت و اہمیت پر زور دیا ہے۔ (ج) سب کے خیال میں 'گلشن' بے غار بے مثل اور منفرد تالیف ہے۔ (د) سب کا خیال ہے کہ شیفتہ آزادانہ اور مصفاہ رائے قائم کرتے ہیں اور اس سلسلے میں بڑے سے بڑے شاعر سے متاثر و محبوب نہیں ہوتے۔ (۵) اور آخری یہ کہ سب نے اپنے دعوے کی تائید کے لیے غالب اور حالی گواہ بنایا ہے۔ یہاں تک پہنچ کر ہمارا تقلیدی یعنی کتبہ تعلیم کا دور ختم ہوا۔ اب میدان ادب میں آزادانہ قدم رکھنے کا زمانہ آگیا تھا۔ ہم نے نسبتاً دشوار گزار رستہ پسند کیا۔ یعنی دشتِ تحقیق کو اپنی

جواں گاہ بنایا۔ انشا پر تحقیق شروع ہوئی اور پھر ہم نے چودہ برس اسی دشت کی بنیادی میں گزار دیے۔ گوناگوں تجربات ہوئے، کئی بنے بنائے بت ٹوٹے، کئی عقیدوں کو دھکا لگا۔ مسلسل تلاش و تحقیق اور تجربے نے نظر میں نور پیدا کیا تو پھر خطہ اس روشنی طبع تو برصِ بلا شدی، کے کرب سے گزرنا پڑا۔ مسلمات یکے بعد دیگرے بکھر رہے تھے۔ بزرگوں کی بزرگی میں گمان ہوئے لگا تھا۔ اسی اثنا میں دل کو ایک اور دھکا لگا۔ احسن مارہروی کے روزنامے میں داغ اور ذوق کے تعلقات سے متعلق کئی واقعات درج ہیں۔ ایک واقعہ کچھ اس طرح ہے داغ استاد ذوق کی ایک غزل کی تخلیق کا حال سن رہے ہیں: ”وہ کچھ دیر بعد ہوئے، داغ! ایک صبح اور مہنگا لکھو...“ یہ فرما کر استاد دوسرے شعر کی غرض غلط ہوئے، باہر میرے ذہن میں بھی ایک صبح آگیا۔ استاد سے عرض کیا حضور ایک صبح میرا بھی سن لیجیے۔ فرمایا سناؤ۔ میں نے کہا عرض کیا ہے،

یہ کس کی لہ ہے اے دل مضطرب لگی ہوئی

اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

الغرض ادھر استاد فکر کر رہے تھے... (دھر میں اپنی غزل مکمل کر رہا تھا: خیمہ یہ ہوا کہ
۱۔ صبح میں استاد اور شاگرد دونوں کی غزلیں مکمل ہو گئیں۔ داغ کے صبح کا مصرع ثانی وہی ہے جو شیفۃ کے قرب المثل صبح کا۔ ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ یہی شعر شیفۃ سے میری عقیدت کی بنیاد تھا۔ اس کا بھی ایک مصرع ”داغی“ نکلا۔ اسے تو ارد کیجیے اور تو ارد سے بڑے بڑے شاعر نہیں بچے، پھر شیفۃ کو الزام کیوں دیا جائے، مگر پھر بھی عقیدت کی بنیاد متزلزل ہونے لگی۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ انشا کے بارے میں شیفۃ کی رائے اچھی نہ تھی، اور ہم انشا پر کام کر رہے تھے۔ ادگتے کو ٹیپلے کا بہانہ، اعتقاد لڑکھڑا گیا۔ آپ جس پر تحقیق کر رہے ہوں (میرا مطلب ہے سند کے لیے) وہ آپ کا محبوب شاعر ہویا نہ ہو، ہیرو و فوری بن جاتا ہے۔ خواہ پایا بن کار بنے لگاؤ۔ تحقیق آپ کے جذبہ ہیرو پرستی کو نقشِ باطل ہی کیوں نہ کر جسے تاہم تنویری در کے لیے آپ کے ماضی ہیرو کا مخالف آپ کو اپنا مخالف لگنے لگتا ہے۔ لہذا یہاں بھی یہ کرید لگ گئی کہ آخر شیفۃ نے انشا کے بارے میں یہ کس بنیاد پر لکھا کہ ”صحیح صنعت سخن را بطریقہ راستہ شعر انگشت“ اگرچہ اس کے فوراً بعد ہی یہ بھی فرمادیا: ”اما در شاعری طبع و جود است“

ذہن اور سنجے نیست " لیکن ان کی اپنی رائے نہیں بلکہ خواب اعظم الذوالہ برود کی ہے جن کا
 عہد منقہ شیفتہ کا سب سے بڑا ماخذ ہے۔ چنانچہ اب ہمیں اپنا ہر دم قائم رکھنے کے لیے
 شیفتہ کے الزام کے رد کی تلاش ہوتی۔ سب سے پہلے مولانا محمد حسین آزاد پر نگاہ گئی جس نے
 فرمایا تھا: " خواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا گلشن ہے خار " جب دیکھتا ہوں تو غلہ نہیں کٹا
 کا زخم دل پر لگتا ہے۔ سید موصوف کے حال میں لکھتے ہیں: بیچ صبح سن را.... الخ " لیکن
 بزراد شیفتہ کی شخصیت سے اتنے مرعوب تھے کہ انہوں نے نادانستہ و یادانستہ (؟) نہ صرف
 قول شیفتہ کی تائید میں قلم توڑ دیا بلکہ انشا کو سہاڑ بھی ثابت کر دکھایا۔ مادودہ جو سر پہ چہ
 کے بولے۔ چنانچہ اور سے ایس ہو کر ان بزرگوں کی طرف رجوع کیا جن کے اقوال بزرگوں
 پہلے گزر چکے ہیں۔ سب نے شیفتہ کو اپنے زمانے کا بہترین اور معتبر ترین ناقد ثابت کرنے کے لیے
 یوحی میں آیا، بے سوچے سمجھے لکھ دیا۔ معلوم ہوا ان سب پر (حالی سمیت) مرزا غالب کا
 شعر مسلط ہے جس کی حقیقت " بھٹی " سے زیادہ نہیں اگر کوئی بہت اگے بڑھا تو اس نے
 حالی کی سند کو ذرا مبالغے کے ساتھ نقل کر دیا اور اس تحریر نے بتایا تھا کہ تحقیق میں سنی سنائی بلکہ نبی
 پڑھائی باتوں پر بے تصدیق پر ایمان لے آنا خام کاری ہے۔ چنانچہ بسم اللہ کہ کر گلشن بے خار
 انشا کی سواے حال کے، سب بزرگوں نے شیفتہ کی تنقیدی عظمت کی بنیاد اسی پر رکھی تھی
 لیکن اس سے پہلے کہ مطالعے کے نتائج سے آپ کو آگاہ کروں چند فقرے ان بزرگوں کے
 اقوال کی نسبت عرض کرنا ضروری ہے جن کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے۔ ان میں رام بابو سکینہ
 اور ڈاکٹر عبادت بریلوی کی آراء سب سے زیادہ مفصل ہیں۔ باقی سب کی باتیں انہی بزرگوں کی
 باتوں میں آگئی ہیں۔ ان میں بھی ڈاکٹر عبادت بریلوی کی رائے قابلِ درگزر ہے کہ اول تو ان کی
 اپنی کوئی رائے نہیں، دوسرے وہ الفاظ کی مصنوعیت یا اہمیت سے بے خبر ہیں۔ اہلناپ
 بے جا ان کا شبہ ہے اور تکرار بے جا ان کا اصول۔ چنانچہ ان کی کوئی تصنیف انشا
 جیسے اس کا ہر تیسرا جملہ وہی ہوتا ہے جو پہلا، یا پھر اس کا عکس چنانچہ بات رام بابو سکینہ
 کے قول سے شروع کی جائے۔

سکینہ صاحب نے بزم خویش کئی نئی باتیں بتائی ہیں۔ (۱) شیفتہ شاعر سے

زیادہ ناقد کی حیثیت سے مشہور ہیں اور اپنے زمانے میں بھی ان کی یہی حیثیت تھی۔ چرمکھا غلط ہے۔ شیعہ کی یہ حیثیت شاعر میر کی کچھ شہرت تھی۔ یہ حیثیت ناقد انھیں سوائے غالب اور مآلی کے کوئی نہیں جانتا بلکہ کوئی نہیں جہاں غائب تھا۔ اگر اپنے زمانے میں ان کی یہ شہرت ہوتی تو کم از کم کوئی اللہ کا بندہ تو خدا لگتی کہتا: گلشن بے غار آخری تذکرہ نہیں ہے، اس کے بعد بھی کئی تذکرے لکھے گئے۔ سب کتابوں کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں، صرف چند نام سن لیجیو۔ ۱۔ طبقات شعراء ہند، ۲۔ تاریخ جدولیہ، ۳۔ آثار الصنادید، ۴۔ گلستان سخن ۵۔ شمع انجمن، ۶۔ طور کلیم، ۷۔ صبح گلشن، ۸۔ بزم سخن۔ ان سب کے مصنفین نہ صرف شیعہ کے معاصر تھے بلکہ کئی تو ان سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً کریم الدین اشقیقہ کے استاد بھائی تھے۔ نواب صدیق حسن خاں شیعہ کے قریبی دوست تھے۔ ان کے بیٹے نور الحسن خاں مصنف طور کلیم شیعہ کو اپنا استاد معنوی مانتے تھے، اس کے باوجود کسی بزرگ نے شیعہ کی تعقیدی بصیرت سے متعلق ایک جملہ بھی نہیں لکھا، کیوں؟ اس لیے کہ اپنے عہد میں شیعہ کی یہ شہرت تھی ہی نہیں۔ (۲) رام بابو سکینہ نے دوسری بات یہ کہی کہ ”گلشن بے غار ایک مبسوط و مشہور تصنیف ہے۔“ یہاں تک تو خشک ہے لیکن ان کا یہ قول کسی غلط فہمی پر مبنی ہے کہ ”ہمارے نزدیک وہ پہلا تذکرہ ہے جس میں انصاف اور آزادی کے ساتھ اشعار کی تعقید کی گئی ہے۔“ (اس ایک فقرے نے تیسرے لے کر مصنفی تک کے تذکروں کی وقعت متنی کردی) انصاف کی بات محض آرائش سخن کے لیے ہے، بہتہ آزادی کی بات دوسری ہے، اس پر آئندہ بات ہوگی۔ تو یہ ہے حال ہمارے سب سے پہلے بلکہ اب تک کے قاعد مورخ ادب کا (یہاں جمیل جاہلی کو عمداً نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ اول تو ان کی تاریخ ادب ابھی مکمل نہیں ہوئی، دوسرے وہ ایک خاص زاویے سے لکھی جا رہی ہے)۔ اگر ادب کا تاریخ نگار بھی ماخذ کو کھنگالے، چھلے پھٹکے اور پر کھسے بغیر محض اس بنا پر کہ ”غالب ایسا صاحب کمال اپنے اشعار کی اچائی اور برائی کی کسوٹی نواب صاحب کی پسندیدگی کو قرار دیتا ہے۔“ ایسے غلط اور گمراہ کن بیان دے گا، تو ادب کے طالب علموں کا کیا ہوگا؟ وہاں غالب کا نواب کی پسندیدگی کو کسوٹی قرار دینا، تو یہ بھی درست نہیں۔ اس کے

یہ غالب اور شیفقہ کے تعلقات نیز غالب کے مزاج کو بھی مد نظر رکھنا ہوگا۔ بہر حال اس کا ذکر کسی مناسب موقع کے لیے اٹھا رکھتا ہوں۔ فی الوقت گلشن بے غار کے نام آشناؤں سے مراد یہ عرض کرنا ہے کہ ۳۶ رسالہ کی عمر میں جب شیفقہ نے گلشن بے غار مرتب کیا تھا، غالب کا دیوان اردو نہ صرف مدون ہو چکا تھا بلکہ نواب کی پسندیدگی کی کھول پر کسے بغیر منتخب بھی ہو چکا تھا۔ اس میں سے تین چوتھائی اشعار حذف ہو چکے تھے اور ایک ٹمٹ اشعار کے دیوان منتخب میں شامل کیے جانے کے راوی خود نواب مصطفیٰ خاں شیفقہ ہیں۔

اس ضمن میں دوسرے بزرگ میں حکیم عبدالحمید جنسوں نے گل رعنا میں غالب کے مذکورہ شعر کا مفہوم اور معانی کے بیان کا ایک فقرہ دہرایا ہے۔ یوں بھی ان پر خط لگے دو تین کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو کا اطلاق ہوتا ہے۔ تیسرا قول پہلے ایک بزرگ محقق کا ہے۔ لیکن اگر تحقیق یہی ہے تو پھر قضیہ کس کو کہیں گے۔ فرماتے ہیں: ”ان کی سخن فہمی کا ثبوت ان کا مشہور تذکرہ گلشن بے غار ہے جس میں ہر شاعر کے متعلق چلی سلی رائیں لکھی ہیں خود ان کے معاصرین ان کے مذاق سخن کے معترف و مداح تھے۔ غالب کہتے ہیں... الم... اس عبارت کا پہلا اور آخری حصہ نیا نہیں۔ آخری جملے میں معانی کا سرٹیفکیٹ اور غالب کے شعر کا ظلم بول رہا ہے۔ البتہ دوسرا جملہ ”ہر شاعر کے کلام کے متعلق...“ اضافہ ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ مصنف نے گلشن بے غار کی ایک ایک سطر پڑھی ہے جسی قولے اس میں ہر شاعر کے متعلق چلی سلی رائیں لکھی نظر آئیں۔ مجھے شبہ ہے کہ یہ جملے لکھتے وقت نور الحسن ہاشمی صاحب نے گلشن بے غار کو کھول کر بھی نہ دیکھا ہوگا۔ انھیں تو شاید یہ بھی علم نہ ہو کہ اس میں کل کتنے شاعروں کا ذکر ہے یہ تو میں بعد میں بتاؤں گا کہ شیفقہ نے کل کتنے شاعروں کے متعلق رائیں لکھیں ان میں کتنی ان کی اپنی اور کتنی دوسروں سے ماخوذ ہیں اور ان میں بھی کتنی ہی غیر مستند تباہی بتا دینا کافی ہے کہ گلشن بے غار میں آرا کا تناسب شعرا کی مجموعی تعداد کا صرف ۱/۱۰ ہے۔

اگلے راسے محمد یحییٰ صاحب تنہا کی ہے، لیکن اسے جانے دیجیے۔ یہ غریب لگے زلف ندالے تنقید و نقید کیا جانیں بولانا محمد حسین آزاد کو دمائیں دیں کہ وہ آپ حیات چھوڑ گئے اور ان بزرگوں کو بھی کتابیں بنانے کی توفیق ہوئی۔

اب میرے سامنے دوا ایسی بزرگ سیتوں کے اقوال ہیں جن کا نام آتے ہی طلبہ ہی نہیں، اساتذہ بھی مُؤدب ہو جاتے ہیں۔ پہلے ان کے اقوال دیکھیے۔ دُعا شفیقہ آخری دور کے بہترین نقادانِ سخن میں شمار ہوتے ہیں۔ ادبی اور فنی نقطہ نظر سے شفیقہ کی رائے منجانب سے ہوتی ہے۔ ”(ا) پڑھانے والے نگاروں میں شفیقہ بڑے مبصر اور منصف مزاج واقع ہوئے ہیں۔ پہلا قول ڈاکٹر سید عبداللہ کلہ ہے اور دوسرا بمنوں گورکھ پوری کلہ ہے۔ دُعا شفیقہ اساتذہ ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ شہناز بھی ہیں، محقق بھی اور ان کی دونوں حیثیتیں مسلم ہیں۔ بہتوں نے ہر فن میں ہوں میں طاق کچھ کیا نہیں آتا، لہذا ان کے حق میں کچھ کہنا مجھ جیسے طالب علم کا منصب نہیں لیکن اگر حیدر آباد بڑی بات نہ بھی جائے تو ب کٹائی کی جسارت کروں۔ آخر وہ کون لوگ ہیں جو شفیقہ کا شمار بہترین نقادانِ سخن میں کرتے ہیں؟ اور اگر یہ کہ سید عبداللہ شہناز — ان ادبی اور فنی نقطہ نظر سے عموماً درست“ آرا میں سے دو ایک نقل فرما دیتے تو میری طرح بہتوں کی رہنمائی ہوتی۔ اسی طرح بمنوں صاحب بھی اس بڑے مبصر کی نصف مزاجی کی دو ایک مثالیں پیش فرما دیتے تو ان کا کیا بگڑا ہوتا؟ خیر چھوڑیے دوسروں کی باتوں کو۔ گلشن بے خار کے براہِ راست مطالعے سے جو نتائج بلکہ اعداد و شمار سامنے آتے ہیں، وہ ملاحظہ فرمائیے۔

گلشن بے خار کی مختلف اشاعتوں میں شعرا کی تعداد مختلف ہے۔ یعنی ۶۶۶ سے ۶۷۶ تک۔ میرے پیش نظر جو ایڈیشن ہے اس میں ۶۷۲ شاعروں کا ذکر ہے جس کی روایت تفصیل یوں ہے:

الف : ۷۰ ، ب : ۲۳ ، ت : ۱۸ ، ث : ۵ ، ج : ۲۲ ، ح : ۳۱ ، خ : ۹۶ ،
 د : ۳۰ ، ذ : ۸ ، ر : ۳۳ ، ز : ۷ ، س : ۲۹ ، ش : ۵۷ ، ص : ۱۹ ، من : ۱۶ ، ط : ۹ ،
 ظ : ۳ ، ع : ۳۱ ، غ : ۱۵ ، ف : ۳۵ ، ق : ۲۰ ، ک : گ : ۱۹ ، ل : ۳ ، م : ۹۳ ، ن : ۳۰ ،
 و : ۱۷ ، ہ : ۱۱ ، اور ی : ۵۔ کل = ۶۷۲۔

ان ۶۷۲ شاعروں میں ۶۲۰ نئے تعلق کوئی رائے ظاہر نہیں کی گئی۔ باقی ۵۲ اساتذہ ہیں۔
 آئندہ، ذوق، درد، سودا، غالب، موتی، میر، ناسخ، نزاکت اور وحشت دس شاعروں کی

شان میں منثور تصانیف ہیں اور ان میں بھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جو پہلے تذکرہ نگار نے کہ چکے ہوں یہ قصائد ڈاکٹر عبادت بریلوی اور پرنسپل عبد الشکور کے ان "بصیرت افروز" بیانات کی تردید کرتے ہیں کہ شیفۃ بڑے سے بڑے شاعر کے متعلق بھی صحیح رائے دینے اور اس کی خامیوں کو اجاگر کرنے سے باز نہیں آتے؟ یا " (ان کے یہاں) تنقید کا پہلو زیادہ جاندار زیادہ نمایاں اور زیادہ صحیح ہے۔۔۔ موانع کو اپنے فرض کا احساس ہے اور اس نے ذاتی تصانیف سے متاثر ہو کر شاعر کے کلام کی تعریف نہیں کی۔" شاید پرنسپل عبد الشکور نے مجموعہ نزاکت کا منثر قسیدہ ملاحظہ نہیں فرمایا بہر حال ۵۲ میں سے دس گئے، باقی ربیعہ ۳۲۔ ان میں ۳۲ شاعر ایسے ہیں جن کے متعلق شیفۃ نے آدھا ایک یا ڈیڑھ جملہ لکھا ہے۔ چند جملے دیکھیے:

- ۱۔ منصب ایہام کی طرت مائل تھا (آبرق) ۲۔ شررشت اور صاف ہیں (آشفۃ)
- ۳۔ فن شعرے الفت تھی (آصف) ۳۔ سخن اور اہل سخن سے محبت رکھتے تھے (آفتاب)
- ۵۔ کہتے ہیں منائع شرعے غیب اکام تھے (آفریں) ۶۔ ان کے ماثقاد شہر دل پر اثر کرتے تھے، منائع فغلی پر بہت ندر دیتے تھے (آسمان) ۷۔ مشاہیر سخن سے تھے (افسوس) ۸۔ کہتے ہیں ان کا شمار سادہ میں ہوتا تھا (الہام) ۹۔ کہتے ہیں ان کے دل پذیر اشعار بہت ہیں، لیکن مجھے ایک ہی شعر اچھا آیا (اتین) ۱۰۔ حیدر آبادی ہیں، کہتے ہیں وہاں علم استاد ی بلند کیے ہوئے ہیں (ایمان) ۱۱۔ ان کا سخن رنگین و شور انگیز ہے (بیان) ۱۲۔ مشاہیر شعرا میں ہیں (دیوان) ۱۳۔ منائع فغلی میں بہت کاوش کرتے ہیں (رافت) ۱۴۔ شعر کی شناخت کا اچھا سلیقہ رکھتے ہیں (رتج) ۱۵۔ ان کی طبع ہموار معلوم ہوتی ہے (سبقت) ۱۶۔ آبرق کے تلامذہ میں ہیں اور انھیں کے طریق کے پیرو (سہلو) ۱۷۔ شاعر قدیم کلام ان کا مستقیم ہے، ماثقاد دیوان ہیں (سردود) ۱۸۔ شاگرد مسمعی، لغزو و سما کا فن جانتے ہیں (شوق) ۱۹۔ فکر شستہ اور صاف طبع گراہی سے پاک (فراق) ۲۰۔ شاہ نصیر کے تلامذہ میں ہیں اور مہر ناستاد کے پیرو (مشیر) ۲۱۔ صاحب دیوان ہیں اکثر خیالات رنگین اور مضامین دل نشین رکھتے ہیں (سروت) ۲۲۔ طرز گفتار خامی و لچب اور ملاحظہ کلام نہایت شیریں مضامین بیگانہ ہائے میں بیگانہ ہیں (سنون) ۲۳۔ طبع ایہام کی طرت مائل تھی (ناتی) ۲۴۔ کلام پر رنگ اور ملاوٹ

دل خواہ رکھتے ہیں (یقیناً)۔ یہ کل دو درجن رائیں ہوئیں، ان میں سے بعض کو رائے کہنا بھی مناسب نہیں۔ ان میں کسی آزادی فکر اور صنعت مزاجی کا پرتو بھی نظر نہیں آتا اور نہ ہی ان کے لیے کسی غیر معمولی ناقذانہ بصیرت کی ضرورت ہے، غیر۔

۳۲-۳۳-۱۸-۱۹-۲۰ شاعروں میں کچھ ایسے ہیں جن کے متعلق شیعہ نے ذلّعی یا

زیادہ جملے لکھے ہیں، مثلاً آخر، "ان کا متفرد بیان نظر سے گزرا، بعض خیالات انتہائی درمندانہ اور دل پذیر واقع ہوئے ہیں۔ ان کی مشنوی بہت مشہور ہے۔ پنجو اس کی بنیاد خاص ملاحہ پر ہے، اس لیے عوام میں مقبول ہے۔" بقا، "ظہین طبع تھے بلکہ عرفات سے گزر کر جو کوئی تک پہنچ گئے تھے، طبع شگفتہ و رنگین اور طرز ہائزہ و شیریں رکھتے ہیں۔" قدت، "مشہور نکتہ جنوں میں ہیں۔ شاعری میں قدرت و قوتِ عظیم رکھتے ہیں۔ ایک عرشی سخن کی طبع صد کہتے تھے اور اشعار خوش ادا کہتے تھے۔" ان تین آرا کے متعلق آپ کو اپنی رائے قائم کرنے کی آزادی ہے۔ اب ہمارے حساب سے صرف ڈیڑھ درجن شاعر باقی ہے، جن کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ کچھ وہ لوگ ہیں جن کے متعلق شیعہ نے سابقین کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ کچھ نئے دیچے،

آتش: اہل لکھنؤ آتش و ناسخ کو وہاں کے سلم الثبوت اساتذہ میں شمار کرتے ہیں اور دونوں کو ہم پتہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن جس شخص کے پاس ذرا سی بھی عقل ہے وہ اس تحقیق کی قیامت کو سمجھ سکتا ہے۔ بہر حال ان کی خوبی طبع میں کلام نہیں۔ ناسخ کے احوال میں ان کا منشور قصیدہ رقم کر کے اپنا یہ دعوای ثابت کرنے کی کوشش کی کہ آتش کو ناسخ سے کوئی نسبت نہیں۔ اس آزادانہ غور و فکر اور اصابت رائے پر آپ خود غور فرمائیں، لیکن شیعہ کے ایک مدّوح مرزا غالب کا یہ قول نظر میں رہے کہ "آتش کے یہاں ایسے فطرتی بشر اور ناسخ کے یہاں کم تھیں۔"

ستودا کے باب میں بھی شیعہ نے بظاہر دوسروں کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔ بہت سی قصیدہ خوانی کے بعد فرماتے ہیں: "وہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ ان کا قصیدہ غزل سے بہتر ہے، محض حرفِ مہمل ہے۔ بزمِ فقیر ان کی غزل قصیدے سے بہتر ہے، اور قصیدہ غزل سے بہتر۔" ستودا بہت اچھے غزل گو بھی لیکن آج اس "غزلِ قد" رائے کو کون مانے گا کہ

سودا نصیب سے آہی غزل کہتے تھے اگر نقد و نظر ہی ہے تو فاجعہ یا اولی الابصار۔ جن میر
سودا کے لیے شیفۃ نے جادہ مستقیم سے برکراں ہونے کا فتوا دیا، ان کی تقریباً ۱۱ غزلیں
برسوں سودا کے کلام میں شامل رہیں اور اہل نظر اس "برکراں جادہ مستقیم" کو سودا کا
زائیدہ فکر سمجھتے رہے۔ بہر حال۔

قائم کے متعلق شیفۃ کا فرمان ہے: "شاعر خوش گفتار و بلند پایہ ہیں۔ بعض سخن
ناشاس انھیں سودا کا ہم مرتبہ سمجھتے ہیں۔ یہ ان کا دیوانہ پن ہے۔ اپنی زمین کو اونچے فلک
سمسنا یا ذرے کو آفتاب کہنا کیوں کر ممکن ہے۔ بہر حال قائم سخن میں دستِ گاہِ دل پسند
رکھتے ہیں۔ گو سودا کے مرتبہ کو نہیں پہنچتے۔" گویا سودا آملن کی طرح بلند ہیں اور قائم زمین کی
طرح پست۔ وہ آفتاب ہیں تو یہ ذرا لیکن اسی ذرے بے مقدار کے کتنے ہی شعریا دوسرے لفظوں
میں کم از کم سات مثنویاں اس آفتابِ عالیشان کے کلام میں شامل ہو گئیں۔ ان میں سے
ایک "شدتِ سرا" تو ہم نے بھی پہچان میں درسی کتابوں میں سودا کے نام سے پڑھی ہے۔
آخر اس ذرے اور اس آفتاب میں کچھ تو مشابہت و مسابقت ہوگی۔

ان کے علاوہ جو دو پار آرا گلشنِ بے خار میں ملتی ہیں وہ شیفۃ سے پہلے دوسرے
تذکرہ نگار اپنے تذکروں میں درج کر چکے تھے۔ شیفۃ نے انھیں کو کچھ رد و بدل یا ترمیم بلکہ تخیل
کے اپنے تذکرے میں شامل کر لیا ہے۔ ان میں سابقین کی آرا پر کمی ہے بیشی نہیں۔ آخر
میں ان آرا کا ذکر ضروری ہے جو جزوً یا کلاً شیفۃ سے منسوب ہیں۔ یہی وہ رائیں ہیں جن میں
سے کچھ کے لیے شیفۃ مشہور ہیں یا جن سے ان کا مخصوص محنت نظر جملہ کتاب ہے۔ ملاحظہ ہو:

۱۔ انشا: "دیوانِ اصنافِ سخن سے ملوے۔ لیکن کسی صنعت کو شعرا کے طریقہ راسخ
کے مطابق نہیں کہا۔ طریقہ راسخ یا جادہ مستقیم شیفۃ کا پسندیدہ فقرہ ہے۔ انھیں ہر شخص
طریقہ راسخ سے مخوف نظر آتا ہے جس میں کچھ ایچ ہو، یا جو قدما کی کھیر پیٹے بغیر پناستہ خود
بنا ناچا جاتا ہو۔ چنانچہ سودا اور میر کو بھی جادہ مستقیم سے برکراں کہا ہے، غالب تو اس لیے
اس فقرے سے بچ گئے کہ وہ ان کے ممدوح و مداح ہی نہیں، استاد بھی تھے اور گلشنِ بے خار
کی تعریف سے پہلے وہ اپنا کچھ کلام رد کر کے ایک ٹکٹ کلام منتخب کر چکے تھے جو شاید

جادہ مستقیم سے برکراں نہیں تھا۔ یہ امر بھی دلچسپی سے غالی نہیں ہو گا کہ سرور جن کے کلام کو شیفتہ مستقیم کہتے ہیں، تذکرہ نہ لکھتے تو آج ان کا نام بھی کوئی نہ جانتا۔

۲۔ قمر حسن: "فطرت سالم اور طبع سلیم رکھتے ہیں۔ فی الجملہ تمام اصنافِ سخن پر قدرت رکھتے ہیں، بے شبہ مشنوی خوب کہتے ہیں۔ سحر البیان جو بدرنہ کے نام سے مشہور ہے، شاعرانہ لہجوں سے قطع نظر محاورہ عوام میں بری نہیں کہی بلکہ اس میں دادِ بلاغت دی ہے۔" ملاحظہ فرمایا پاکپ نے! جس مشنوی نے میر حسن کو زندہ جادید کر دیا اس کے لیے نواب صاحب کا خیال ہے: "در محاورہ عوام بد نگفت۔" یہ عوام اور محاورہ عوام ہے، جس سے طبع شرفاً کو نفرت تھی، در نہ دادِ بلاغت دینے کا احتیاط تو نواب صاحب کو بھی ہے۔

۳۔ میر سوز: "ان کی شعر خوانی کا پسندیدہ طرز مشہور جہاں ہے اور کلام جادہ مستقیم سے برکراں۔" اتنے بڑے استاد کے لیے شیفتہ کو مرثیہ آدھا فقرہ سوجھا کلامش از بانہ مستقیم برکراں "شعر خوانی کا پسندیدہ طرز تو مشہور جہاں تھا۔ شیفتہ نہ اس کے چشم دید گواہ ہیں نہ راویِ آواز۔

۴۔ صاحبِ قمرال: "ان کے تمام اشعار ہزل سے پُر ہیں۔ اگرچہ مضامین دلپذیر رکھتے ہیں لیکن جہاں بے حمور ہے؟ اس کے باوجود اس تڑال کا ایک شعر چونکہ دوسروں نے لکھا تھا، شیفتہ نے بھی نقل کر لیا۔ یہاں "تام" کے لفظ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ شیفتہ کی کسائی اسی ایک شعر تک تھی۔

۵۔ عشق: "صاحب تصانیف بسیار ہیں۔ تاہم ان کے دوادین میں سے ایک کے پیش نظر، جو ہماری نظر سے گزرا ہے، اور میں سے یہ شمار منتخب ہوئے ہیں، (اندازہ ہوتا ہے) کہ شاید وہ سب دیکھنے کے قابل نہ ہوں۔" محض اچھے اشعار کی بنیاد پر کسی کی سب تصانیف پر حکم لگانا شاید آزادیِ فکر اور ضعفِ مزاجی کی دلیل ہے۔ یہ عشق میر غنی ہیں جن کا تخلص مبتلا بھی تھا جو صاحب تذکرہ ہیں۔ شیفتہ نے قاسم کے بیٹے عشق کی بابت بھی ہنسیر دیوان دیکھے اپنی رات کا اظہار کیا ہے: "باوجود خواہش کے ان کا دیوان ہاتھ نہ آیا۔ در نہ بزمِ فقیر ان کے اکثر اشعار قابلِ رقم ہیں۔" یا بلالہمب!

۶۔ عشرت : صاحب دیوان ہیں جو نظر سے نہیں گزرا۔ البتہ ان اشعار کے خیال نظر جو چشم دگوش تک پہنچے ہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ عشرت کسی مقام پر نہیں پہنچے۔ ان کے کل چھ شعر (ایک ردیف ن اور ۵ ردیف ی) نقل ہوئے ہیں۔ وہ بھی ان کے دیوان سے نہیں کسی تذکرہ سے، اور انھیں کی بنیاد پر عشرت کی بے مقامی ان پر آئینہ ہو گئی۔ اسے کہتے ہیں دیگ میں سے ایک چاول دیکھ کر پوری دھج کا اندازہ لگانا۔

۷۔ غفتر : ارباب تذکرہ نے لکھا ہے کہ جرأت کے شاگردوں میں سب سے ممتاز ہیں لیکن فقر کی نظر سے ایسا کوئی شعر نہیں گزرا جس سے اس کی تصدیق ہو سکے سوائے پہلے شعر کے جو استاد کے انداز سے بہت ملتا ہے؟ انصاف شرط ہے۔ کل چار شعروں سے کیوں کہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ غفتر جرأت کے تلامذہ میں ممتاز تھے کہ نہیں۔ پھر ان چار شعروں میں جو اپنی اپنی جگہ بہت خوب ہیں، پہلے شعر میں تو آپ کو بھی استاد کے انداز سے مشابہت بلکہ بہت مشابہت نظر آئی۔ پھر خواہی خواہی دوسروں کے قول کی تردید کیا ضرور تھی؟

۸۔ کتبم : ”دونوں زبانوں میں شعر کہتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ فارسی میں ان کی زبان درست اور فکر مناسب تھی۔“ گویا اردو میں نہ زبان ہی درست تھی اور نہ فکر ہی مناسب یہاں یہ ذکر بے فعل نہ ہوگا کہ کتبم تیسرے کے بھانجے ہیں۔

۹۔ مہمئی : چچے دیوان اور دو تذکرے ریختہ (گوپوں) کے اور دو دیوان اور ایک تذکرہ فارسی (گوپوں) کا لکھا۔ ان کی قوتِ مشق کا اندازہ اسی سے ہو جاتا ہے ہر چند کہ بسیار گوئی سے اکثر کلام بہت کم مایہ اور لطافت سے خالی ہے تاہم ان کے منتخب اشعار بہت بلند ہیں۔ آرزو کا تیسرے پستش نہایت پست والا فقرہ دوسرے لفظوں میں مصحفی چرچاں کر دیا ہے۔ لیکن شامل تذکرہ ۶، منتخب اشعار میں دو چار بھی ”بہت بلند“ کا نمونہ نہیں ہیں۔ بہر حال ”اکثر کلام بہت کم مایہ اور لطافت سے خالی“ توجہ طلب ہے۔

۱۰۔ متیر : طبیعت بھی پائی تھی لیکن بے علمی کے سبب اس فن کی ضروریات سے کسرِ واقفیت تھی اس لیے طرہٴ راستہ شعرا سے برکراں تھے۔ فن سے ناواقفیت کا یہ

فقرو شاہ فقیر کے بیٹے کے لیے ہے جس کے پاس علم چلے نہ ہو، فن کی ضروریات سے بحسب نادانیت مشکوک ہے۔

۱۱۔ نظیر: "اشعار بہت ہیں جو سوتیلیوں کی زبان پر جاری ہیں۔ ان اشعار کے پیش نظر نظیر کو شعرا میں شمار نہیں کرنا چاہیے؛ چلیے فراغت ہوئی۔ آخر سیلوں شیلیوں کے بیان، یا گوری پیسے اور تنجاہ نامے کو شرفا شامری تو نہیں کہہ سکتے۔ یہاں تہیر کا ایک شعر نظیر کی زبانی شیفتہ کو مخاطب کر کے پڑھتے کو بھی چاہتا ہے :

تو ہے بچارہ گدا مستیہ ترا کیا مذکور

مل گئے خاک میں یہاں متا افسر کتنے

غالباً اسی قسم کی آرا کو دیکھتے ہوئے قطب الدین باطن نے کہا تھا: گلشن بے خار تایف... شیفتہ دیکھا... یہ حضرت نوابی پر فریفتہ (ہیں) سب کو حقارت سے یاد کیا، اپنی اوقات برباد کیا۔ آخر میں مرث دو رائیں اور گواہ کر لیجئے تاکہ آپ پر آزادانہ غور و فکر، اصابت رائے، کسی سے متاثر و موعوب نہ ہونے کی صفت کے علاوہ منصف مزاجی کی حقیقت بھی واضح ہو جائے۔ جرات کے مال میں نکھلے ہے: چوں از اصول و قوانین این فن بہرہ نداشت، نتماء (؟ نعمت ہے) خارج از آہنگ می سرودہ، و آوازہ اش چوں مبطل دور دست، از انست کہ پذیرائی خاطر دگوارائی او باش، و الوطاح حرف میزدہ۔ یہ گویا جرات اصول و قوانین فن سے بے بہرہ تھے اور ان کے فن سے آہنگ سے خارج تھے۔ ان کی شہرت محض اس لیے تھی کہ ان کا کلام او باحثوں اور لوٹیلوں کی پسند کے مطابق ہے۔ لیکن جب انہیں جرات کے استاد جعفر علی حسرت کا ذکر کیا تو لکھا: "در فن نظم از کلاغہ سرب سنگ (سکہ) دیوانہ و در سلاست عبارت و سلاست فکر مشہور زمانہ" یعنی حسرت دیوانہ کے شاگرد ہیں اور سلاست عبارت اور سلاستی فکر میں مشہور زمانہ ہیں۔ جس جرات کے لیے ارشاد ہوتا ہے: "قلند بخش جرات از شاگردان اوست اما از استاد نصب اسبق رہودہ"۔ گویا جرات سلاست عبارت اور سلاستی فکر میں اپنے استاد سے بھی باری لے گئے ہیں۔ جب سلاستی فکر میں انہوں نے اپنے مشہور زمانہ استاد کو بچھاڑ دیا ہے تو اصول و قوانین

فن سے بے بہرہ کیوں کر ہوئے؟

مذکورہ تمام آرا کو دیکھنے کے بعد شاید آپ ہمارے اس خیال سے اتفاق کریں جو کئی سال پہلے انشا پر اپنے تحقیقی مقالے میں ہم نے ظاہر کیا تھا: ”گلشنِ بے خار میں“ میرے اپنے شمار کے مطابق ۶۷ شاعروں کا ذکر ہے۔ چھ سو سے اوپر شاعروں کے باب میں تنقید کے نام پر ایک لفظ نہیں لکھا گیا۔ پانچ سات شاعروں کو چھوڑ کر جن لوگوں کے کلام پر شیعہ نے کسی رے کا اظہار کیا وہ قدیم تذکروں سے منقول و ماخوذ ہے اور نصف درجن شعرا کے باب میں، جہاں شیعہ نے قدما کی رے سے انحراف کیا ہے، انتہائی غیر معقول اور متضاد بیان دیے ہیں۔

یہ ہے گلشنِ بے خار کی کل کائنات اور شیعہ کی تنقیدی بساط۔ لیکن یہ مقالہ ابھی ختم نہیں ہوا، ابھی اس میں حوتِ آخر کا اضافہ کرنا باقی ہے۔ اس ساری طواریطِ ازکی، تجزیہ یا جراثیمی کے باوجود اس معیت کا اظہار نہ کرنا بے انصافی بلکہ بے ایمانی ہوگی کہ اس میں شیعہ بیچارے کا کیا تصور کسی دوست نے فرمائش کی، انھوں نے تذکرہ لکھ دیا۔ اس میں کہیں نقاد ہونے کا دعوا نہیں کیا، انھوں نے صرف اچھے اشعار انتخاب کرنے کا وعدہ کیا تھا جسے وہ کسی دم سے پورا نہیں کر سکے۔ غالب اور عاقل اس لیے قصور وار نہیں کہ مدح میں مبالغہ جائز بلکہ مستحسن ہے۔ دونوں حق نمک ادا کر رہے تھے۔ جس کا کھلے، اس کا کھلے، مثل مشہور ہے اور اس کا اطلاق عاقل پر بھی ہوتا ہے اور غالب پر بھی ورنہ غالب شیعہ کے قصیدے میں یہ کیوں کر لکھتے:

آں بہاے تیز ہر دوازم کہ بال
در ہواے مصطفیٰ خاں می زخم

عرفی و خاقانی شمسراں پذیر
سکہ در مشیر از و شرراں می زخم

۵ اور غریبیت و من چاؤشیں دار
بانگ بر اجرام و ارکاس می زخم

مہر درزی میں کہ ہاشم بزم نہیں
من کہ زانو پیش در ہاں می زخم
بھلا ان اشارہ میں حقیقت کتنی ہے؟ کیا غالب کے کہنے سے عرفی وفاقانی شیفتہ
کے غلام ہو جائیں گے؟ یا خود غالب ان کے پاکروں میں شامل یا شیفتہ کے دربان سے
بھی کہ قدر ٹھہریں گے؟ اس مبالغہ آرائی کا سبب غالب کے حبسہ میں ملے گا، ملاحظہ ہو:

خود چرخوں خورم از خم کہ پنجم خواری من
رحمت حق پہ لباس بشر آمد، گوئی
نواہد ہست دریں شہر کہ از پرستش نئے
پایہ خویشتم در نظر آمد، گوئی
مصطفیٰ خاں کہ دریں دقو غم خواہم است
گر بریرم پہ قدم از رنگ بدادار من است

ملاحظہ فرمایا آپ نے۔ غالب کے زمانہ اسیری میں شیفتہ ان کے غم خوار تھے غم خواری
و غم اداری کے لیے ان کے موجود ہونے سے غالب کو مرنے کا بھی غم نہیں، نواب صاحب نے
بوہر امن و دوستی کا حق ادا کیا تھا لہذا غالب انھیں لباس بشر میں رحمت حق کہتے ہیں۔
اس حقیقت کو نظر میں رکھیے تو اندازہ ہوگا شیفتہ کو غالب کی ”سند نقادی“: غالب بہ فن
گفتگو... ایک قیمتی قصیدہ ہے جو غزل میں در آیا ہے اور یقیناً گلشن بے خار کی تصنیف کے
بہت بعد وجود میں آیا، ورنہ اسے گلشن بے خار میں جو ناپا ہے متا جس میں غالب کا طویل
مثنوی قصیدہ بصورت تقریظ شامل ہے اور جس میں ہر طرح کی تعریف و توصیف موجود ہے،
اگر نہیں ہے تو صرف نقادی کی سند۔ بلکہ غالب کو یہ احساس ہے کہ انھوں نے نواب کی

ضرورت سے کچھ زیادہ ہی تعریف کر دی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں: "... و انم کر دیدہ آہو
 بین است و گروہ از حکمت چیناں در کمیں، باہمد گرسر ایندہ کرفلانے درستون مبالغہ
 از اندازہ ہمد و بگزات داد تر زبانی داد۔ ہے ہے مدح سخن و آنکھ گران بفرق ..."

اب ہے مولانا مآلی تو وہ بھی نواب صاحب کے ملازم اور تربیت یافتہ تھے۔ شیعہ
 کی زندگی کے آخری نو سال ان کی رفاقت میں رہے۔ ظاہر ہے یہ شیعہ کی پختگی کا زمانہ تھا۔
 ممکن ہے اس دور میں جب مآلی ان سے "سخن میں مستفیض" ہوتے تھے ان کی رائے ویسی
 ہی ہو جیسی مآلی نے لکھی ہے۔ لہذا ان کی تحسین سے مآلی کی نظر میں اپنے شعر کا مرتبہ یقیناً
 بڑھ جاتا ہوگا اور ان کے سکوت سے ممکن ہے اپنا کلام خود ان کی نظر سے گر جاتا ہو۔ لہذا
 انھوں نے بھی شیعہ کو نقادی کی سند عطا کر دی تو گویا اپنے حق تک سے ادا ہوئے۔ انہیں
 مطعون کرنے سے فائدہ؟ یہ ایک نمک خوار کی اپنے ولی نعمت کی نسبت لئے ہے۔ ضروری نہیں
 دوسرے بھی اس سے متفق ہوں۔ اگر ایسے لوگوں کا کوئی خارجی وجود ہوتا اور مآلی نے یہ رائے
 کسی تحریری مائدے ماصل کی ہوتی تو اس کا حوالہ دینے میں کیا امر مانع تھا؟ گلشن بے غار تو
 مآلی کی نغیر سے ہی گزرا ہوگا۔ اگر اس میں ان کے اپنے نظریے کی تائید ہو سکتی تو وہ غالب کے
 شعر کی بوجہ گلشن بے غار کی سند پیش کرتے۔ بہر حال غالب ہوں یا مآلی جن حالات کے
 زیر اثر خوب نے اپنے بیان دیے، ان کے چشم نظر وہ قابل گرفت نہیں۔ خطا وار
 تو ہم ہیں۔ گو اپنے محنتوں اور ناقصوں کہے جنھوں نے غالب کے ایک شعر اور مآلی کے چند
 سائنشی نقروں کو لے کر کتابیں کالی کر ڈالیں لیکن گلشن بے غار کو دیکھے ہمک کی زحمت گوارا نہیں
 فرمائی مگر ہوس کتاب سازی اور شہرت کے ان طلب گاروں سے ہے جنہیں یہ بھی معلوم
 نہیں کہ گلشن بے غار میں کتنے شاعروں کا ذکر ہے۔ اس میں کتنے شاعروں کے کلام پر راس کا
 نظیر کیا گیا ہے، کتنی آراء دوسروں کی ہیں، کتنی تذکرہ نگار کی اپنی۔ مجھے شک ہے کوئی عالم گلشن
 بے غار کی کسی ایک رائے کو بھی کلی طور پر نواب مصطفیٰ خاں کی اپنی رائے ثابت کر سکے گا۔

لہذا قابل ازم انکے بزرگ نہیں ہم اور مرث ہم ہیں کہ ہماری کوتاہ بینی یا تعصید کی زبان میں
 نہ خیزی زمین، پرواز خلیق و رطبائی نے نواب شیعہ سے ایک ایسی صفت منسوب کر دی

جو لکھن میں تھی ہی نہیں۔ تاوانسنگی اور لاطمی سے ہم ان کے نیک نامی میں بٹا لگانے کے
 موجب بنے بلکہ پچ تو یہ ہے کہ اپنی سہل نگاری اور تقلیدی ذہنیت سے ہم نے اپنی روحانی
 کاسماں کیا اور بس!

اس مقالے کی تیاری میں مندرجہ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔

- ۱۔ غالب از غلام رسول مہر، ۲۔ کلیات غالب (فارسی، مرتبہ نورانی، ۳۔ یادگار
 غالب ۱۹۵۸ء ڈیٹیشن الر آباد، ۳۔ شریعہ اردو کے تذکرے از ڈاکٹر سید عبدالشود، شعرا
 اردو کے تذکرے از ڈاکٹر ضیعت نقوی، ۴۔ گلشن بے غار مطبوعہ ۱۹۸۷ء، ۵۔ مرزا محمد رفیع
 ستودا از خلیق الجہد گستان بے غراں از قطب الدین باطن، ۶۔ اردو کی نثری داستانیں
 از گیان چند مین، ۱۰۔ ذوق سوانح اور اعتقاد از ڈاکٹر تنویر احمد ملوی، ۱۱۔ تحقیق کی روشنی
 میں از عندلیب شادانی، ۱۲۔ اردو تنقید کا ارتقا از عبادت بریلوی، ۱۳۔ گل رعنا از ملکیم
 عبدالحی، ۱۴۔ تاریخ ادب اردو از سکسینہ ترجمہ مرزا مسکری، ۱۵۔ دلی کا دبستان خامی
 از ڈاکٹر فوراحسن ہاشمی، ۱۶۔ انشا کے حریت و حلیت از عابد پشاوروی۔

تہ تیغ پر ایک نظر

غالب کے اردو رسالے تہ تیغ کا پہلا اولیشن مطبع اکمل المطابع (دہلی) سے شائع ہوا تھا۔ غالب کے ایک خط سے پتا چلتا ہے کہ تہ تیغ ۱۸ مارچ ۱۸۶۷ء تک علمی جاری تھی۔ ہمیش پر شاہ کا یہ ارشاد درست نہیں کہ تہ تیغ ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے ماننے کے یہ معنی ہوں گے کہ تہ تیغ تحریر ہونے سے قبل ہی شائع ہو گئی تھی۔ ظاہر ہے کہ جو کتاب ۱۸ مارچ ۱۸۶۷ء تک زیرِ تسوید رہی تھی اس کا ۱۸۶۶ء میں چھپ جانا خارج از امکان ہے۔ تہ تیغ میں غالب کی جو فارسی تاریخ چھپی ہے، اس مضمون بڑا ہے کہ اس کتاب کا سالِ تحریر و سالِ طباعت ۱۸۶۷ء ہے۔

تہ تیغ مطبع اول کی ضخامت ہمیش پر شاہ اور خلیل الرحمن داؤدی نے ۲۳ صفحات اور ڈاکٹر محمد فصلا اللہ نے ۲۶ صفحات بتائی ہے۔ جو درست نہیں۔ تہ تیغ مطبع اول کی ضخامت (خلط نامے کا ایک منظر شامل کرنے کے بعد) ۳۲ صفحات ہے۔ غالب کا یہ مختصر اردو رسالہ اپنی پہلی اشاعت ۱۸۶۷ء کے سو برس بعد ۱۹۶۷ء میں ہندوستان اور پاکستان میں دو بارہ شائع ہوا۔ تہ تیغ کی ۱۹۶۷ء کی ان جدید ہندوستانی اور پاکستانی اشاعتوں کی موجودگی میں ذکر غالب (طبع فروری ۱۹۷۶ء ص ۱۷۸) میں مالک رام کا یہ قول ناقابلِ قبول ہے کہ ”یہ

رسالہ بار اول طبع اکمل المطابع سے ۱۸۹۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ نہیں چھپا۔
 غالب کی فارسی کتاب قاطع برہان کے نتیجے میں جو ادبی مرکز چھڑا تھا وہ مخالفین
 و موافقین قاطع برہان کی جانب سے متعدد کتابیں وجود میں لایا۔ تنقح تیز اسی سلسلے کا ایک اردو
 رسالہ جو غالب نے مویہ برہان مؤلفہ آغا جمل احمد کے جواب میں لکھا تھا۔

تنقح تیز کے زمانہ تحریر کا متعین بھی ضروری ہے۔ غالب بلیوگرانی (حصہ اول ص ۳۰) میں
 تنقح تیز کا زمانہ تحریر ۱۸۹۱-۹۲ء قرار دیا گیا ہے۔ یہ اندراج نظر ثانی کا محتاج ہے۔ تنقح تیز میں
 جاہ مایہ برہان (طبع ۱۳۸۲ھ مطابق ۱۹۶۵-۶۶ء) کے صفحات کے حوالے دیے گئے
 ہیں، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تنقح تیز مولوی احمد علی کی کتاب مویہ برہان کی طباعت (۱۳۷۲ھ
 مطابق ۱۸۹۵-۹۶ء) کے بعد ہی لکھی گئی تھی۔ ان حالات میں تنقح تیز کا ۱۸۹۱-۹۲ء میں تحریر
 ہونا خارج از امکان ہے۔

و سہاچے تنقح تیز میں غالب کے مشائخ یا انوں سے پتا چلتا ہے کہ تنقح تیز مندرجہ ذیل
 کتابوں کی طباعت کے بعد لکھی گئی تھی:

- ۱۔ مرقی قاطع برہان ۱۰۔ المطالع شبی ۳۔ ساطع برہان ۳۔ مایہ غالب ۵۔ دیباچہ فارسی
- ۶۔ مویہ برہان ۷۔ قاطع القاطع۔

میری مسلمات کے مطابق یہ تمام کتابیں ۱۲۸۰ھ سے ۱۲۸۳ھ (۱۸۹۳ء سے ۱۸۹۶ء)
 تک چھپی تھیں (ذکر غالب ص ۱۷۹ تا ۱۷۸) گویا تنقح تیز ۱۸۹۶ء کے بعد ہی تحریر ہوئی ہوگی۔
 تلاش کرنے پر آگاہ کے نام غالب کے دو ایسے خطوط بھی ملتے ہیں جو تنقح تیز کے زمانہ تحریر و سند
 اشاعت کو متعین کرنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ غالب کے ان دونوں خطوں کے مختلفہ
 حصے درج ذیل ہیں:

(۱) ... مویہ برہان میر سے پاس بھی آگئی ہے اور اس کے فراغت
 کا حال بہ قید شمار صفو و سطر لکھ رہا ہوں، وہ تمہارے پاس پہنچے گا
 شرط عورت۔ پر شرط آں کہ جاتی نہ رہی ہو اور باقی ہو، یہ ہے کہ میں
 ہوں نہ نہ، تم اس کا جواب کھو۔ میر۔ پیچھے ہوئے اقبال جہاں

جہاں مناسب جالو، درج کر دو۔ میں اب قریب مرگ ہوں
نڈا ہانکل مفتوحہ اور امر امن مستولی۔ بہتر برس کی عمر... پچھ

(ب) "... بندہ نواز! میں نے لکھا کہ مویہ برہان میرے پاس آگئی ہے
اور میں اس کے اعتراض کے جواب میں نشان مفتوحہ سطر ایک
تختہ کاغذ پر لکھ رہا ہوں۔ بعد اقام نگارش تمہارے پاس اس جلا
سے بھیجوں گا کہ ازراہ عنایت مویہ کا جواب لکھو، میری نگارش جو
پسند آئے اس کو بھی جاہ جادرج کر دو۔ تم نے اس درخواست کا
جواب ہاں نہ لکھا۔ اب عنایت فرما کر... جواب لکھیے۔

ذکا کے نام غالب کے مولد بالا غلطوں پر بالترتیب ۱۳ مارچ ۱۸۹۶ء نیز ۱۸ مارچ ۱۸۹۶ء
کی تاریخیں مرقوم ہیں اور ان غلطوں سے تختہ تیز کے متعلق مندرجہ ذیل امور کا پتا چلتا ہے :

۱۔ تختہ تیز ۱۳ مارچ سے ۱۸ مارچ ۱۸۹۶ء تک لکھی جا رہی تھی۔ گویا تختہ تیز
کی تکمیل ۱۸ مارچ ۱۸۹۶ء ۱۱ بجے ۱۱ ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ کے بعد
ہوئی ہوگی۔

۲۔ غالب کا بیان ہے کہ تختہ تیز کچھ وقت اُن کا سن ۷۲ سال تھا۔
اسی تاریخ و وقت ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کی بنیاد پر غالب ۸ رجب
۱۳۸۳ھ کے بعد ۷۲ ویں سال میں لگے تھے اور وسط مارچ ۱۸۹۶ء
درمابین ذی قعدہ ۱۳۸۳ھ میں جب تختہ تیز زیر تصدیق تھی تو غالب
کی عمر ۷۲ سال تھی۔

۳۔ تختہ تیز کے متعلق غالب نے اپنے خط میں کہا ہے کہ یہ کتاب انھوں نے
ضیفی مزیداری اور گزوری کی حالت میں ایسے وقت لکھی تھی جب
انھیں اپنی موت بہت قریب محسوس ہو رہی تھی۔ تختہ تیز طبع اول

(ص ۲۸) کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی غالب کی اس حالت کی تصدیق ہوتی ہے:

”... اگرچہ ابھی برسشیں بہت باقی ہیں، لیکن
 بڑھاپا اور امراض اور ضعف مفرط انہیں دیکھنے دینا
 صبح سے شام تک پانگ پر ڈارہنا ہوں، لیٹے لیٹے
 مسودہ کیا، اور اسباب کو دے دیا، انہوں نے سنا
 کر لیا...“

۳۔ تنقید کا سبب اشاعت ۱۸۶۷ء ہے مگر نوک بالا خطوں سے اس مسئلہ پر
 پرہ اضافہ ہوتا ہے کہ تنقید ۱۸ مارچ ۱۸۶۷ء کے بعد چھپی ہوگی۔

تنقید اس لحاظ سے بھی اہمیت رکھتی ہے کہ قاضی برہان کے اولیٰ سفر کے سلسلے میں
 غالب کے تحریر کردہ تمام رسائل میں یہی آخری رسالہ ہے اور اس کے جواب میں مولوی احمد علی نے
 جو فارسی کتاب غمشیر تیز تر لکھی تھی اسے غالب نے دیکھ کے تھے۔ کیوں کہ یہ غالب کی وفات ۲۰
 ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ کے بعد ۲۹۶ھ میں چھپی تھی۔ (ذکر غالب ص ۱۸۱)۔

تنقید کا آغاز غالب کی ایک تمبیدی تصویر سے ہوتا ہے جس پر کوئی عنوان درج نہیں
 لیکن کتاب کے آخری صفحے میں غالب کے مندرجہ ذیل بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تمبیدی تصویر
 تنقید کا دیباچہ ہے:

”... اب میری تحریر تو تمام ہوئی، اسباب صاف کر میں تو طبع میں حواسے
 کروں اور انطباع جیسا کہ دیا ہے میں وعدہ کر آیا ہوں عمل میں لائوں؟“

اس طرح تنقید غالب کے اردو دیباچوں کی محدود تعداد میں ایک دیا ہے کا اضافہ
 کرتی ہے۔ دیباچہ تنقید کو شامل کر کے غالب کے اردو دیباچوں کی تعداد آٹھ ہو جاتی ہے۔

”تنقید کے آخر میں ”اللہ اکبر“ کے عنوان سے اردو میں جو استفعا چھپا ہے اس کے
 جوابات نواب مصطفیٰ خاں شیعہ نے دیے ہیں اور ان جوابات کی تائید کرنے والوں میں مولانا
 اطمین حسین مآلی بھی شامل ہیں۔ اگر اس استفعا کو استفادہ خط قرار دیا جائے تو مآلی کے نام

غالب کا یہی ایک اُردو خط ملے گا۔ مولانا حالی کے نام اُردو نثر میں غالب کا اس کے علاوہ کوئی اور مطلوبہ خط سراسر دستِ دستیاب نہیں ہوا ہے گویا تخی تیز غالب کے اُردو خطوط کی تعداد میں ایک ایسے استفساری خط کا اضافہ کرتی ہے جس کے چار مکتوب الہم میں شیعیت و محالی کے نام بھی شامل ہیں۔

تخی تیز کی فصل نمبر ۱ میں محمد حسین برہان کے فارسی لغت برہانِ قاطع پر غالب نے اُردو میں بعض ایسے اور اعتراضات درج کیے ہیں جو غالب کی فارسی کتاب قاطع برہان طبعِ اول پر اضافہ میں، البتہ یہ قاطع برہان کے دوسرے ادیشن میں شامل ہو چکے ہیں۔ قاطع برہان کی دونوں اشاعتوں کی زبان فارسی ہے، اُردو دلائل مطلقوں تک غالب کے یہ اضافہ شدہ اعتراضات تخی تیز ہی کی مدد سے رسائی حاصل کرتے ہیں۔

تخی تیز کی پہلی فصل کا آغاز بہ طرزِ مثنوی غالب کی ایک فارسی تاریخ سے ہوتا ہے یہ مثنوی غالب کے ایسے غیر متداول فارسی کلام کی حیثیت رکھتی ہے جو کلیاتِ غالب طبع ۱۸۹۲ء طبع جنوری ۱۸۹۲ء طبع فوری ۱۸۹۶ء نیز بلحاظ دودر طبع ۱۹۰۰ء وغیرہ پر اضافہ ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح تخی تیز، غالب کے فارسی کلام پر کمر کرنے والے صاحبِ قلم کے لیے بھی مفید ثابت ہوتی ہے۔ تخی تیز سے غالب کی یہ تاریخ درجِ ذیل ہے:

- (۱) بر آئیم بہ نیرودی بن تخی تیز کہ مغز مسدود را کنم ریز ریز
- (۲) مدد آں کہ برہانِ قاطع نوشت بہ گفتارِ ست و بہ ہنجا و زشت
- (۳) گر گشت آید کہ او مُرد و رفت ز مغزِ چہ خواہی بھی اے شگفت
- (۴) ز مغزِ خرد جستہ اندچہ سوز کہ در زندگانی نیز مغزِ شش نبود
- (۵) امید آن کہ گفتارِ آن بے ہند گنم ہم بہ گفتارِ زیر و زبر
- (۶) امید آن کہ چون کارِ سازی کنم بدین نامہ دشمن گدازی کنم
- (۷) "نہ نامہ گز فرما اقبال او" یکے تخی تیز "آمدہ سال او

اس تاریخ کی آخری بیت کے مصرع ثانی میں آواز: "یکے تخی تیز" سے ۱۸۹۷ء متخرج ہوتا ہے جو تخی تیز کا سال تکمیل و انطباع ہے۔ مولانا محمد حسین غازی نے اس آواز سے

سے سو فرمائی۔

- ۲۔ تجلّی تیز میں غالب نے آغا احمد علی کی کتاب مویذہ برہان کے بعض چند اعتراضات کے غیر تسلی بخش جواب دیے ہیں۔ آغا احمد علی کے متعدد اعتراضات تجلّی تیز نا موافق ہیں۔
- ۳۔ غالب نے تجلّی تیز میں بعض ایسے غیر متعلق امور پر بھی بحث کی ہے جو غالب اور صاحب مویذہ برہان آغا احمد علی میں ماہہ النزاع نہ تھے۔
- ۴۔ غالب نے تجلّی تیز میں مویذہ برہان کے ایک فقرے کو تحریف شدہ شکل میں درج کر کے، اس پر جو اعتراض کیے ہیں اور مویذہ برہان میں زیر بحث فقرے کی اصل بے سقم شکل دیکھنے پر درست نہیں رہتے۔ مویذہ برہان میں یہ فقرہ یوں تھا: "غم تا ہی گفتار پارسی خورد" غالب نے اسے تجلّی تیز کی فصل نمبر ۶ میں یوں لکھا ہے: "غم گفتار پارسی زبان خورد" (نقد غالب ص ۵۳)۔

- ۵۔ غالب نے تجلّی تیز کی نویں فصل میں لفظ آہنگ کے متعلق مولوی احمد علی پر جو الزام عائد کیے ہیں وہ مویذہ برہان کے مطالعے کے بعد درست ثابت نہیں ہوتے۔
- ۶۔ غالب نے تجلّی تیز کی فصل نمبر ۶ میں لکھا ہے کہ اعتراض کا سرقہ نہیں ہو سکتا۔ غالب کا یہ قول ناقابل قبول ہے غالب نے قاطعہ برہان طبع اول میں نہ صرف صاحب فرہنگ سامانی اور خان آرزو کے اعتراضات کو دہرایا ہے بلکہ بعض ایسے اعتراضات کو بھی شامل کتاب کیا ہے جو برہان قاطع کے حواشی میں پہلے سے ہی موجود تھے۔ قاضی جہد الودود نے غالب کے اس طرز عمل کو سرقہ قرار دیا ہے۔ (آثار غالب ص ۴۰ تا ۴۱)

- ۷۔ تجلّی تیز کے آخر میں استغنا شامل ہے جس میں غالب نے نواب مصطفیٰ خاں شینہ مولانا حالی و ضیاء الدین احمد خاں شیر رشتاں وغیرہ سے اپنے نظریات کی تائید کرائی ہے۔ یہ تینوں افراد غالب کے شاگرد تھے۔ ظاہر ہے کہ قاطعہ برہان کے جو معترضین خود غالب کی فارسی دانی کے قائل نہ تھے، وہ غالب کے شاگردوں کو کیا ناظر بن لاتے۔ حیرت ہے کہ اتنی واضح اصولی بات غالب کی سمجھ میں نہ آئی۔

- ۸۔ تخت تیز کے استغنا میں غالب کی تائید کئے والے افراد ہندوستانی تھے۔ اور غالب ہندوستانی فارسی دانوں کو بڑے زور و شور سے نامستبر قرار دیتے رہتے تھے۔ غالب کا ہندوستانی فارسی دانوں سے اپنی تائید کرنا خود غالب کے نظریے کے منافی ہے۔
- ۹۔ تخت تیز کی پانچویں فصل میں غالب نے ”چشم عیب ساز“ کی ترکیب کو غلط قرار دیا ہے۔ غالب کا یہ اعتراض دیا پڑ برہان قاطع کی ترکیب ”دیدہ عیب ساز“ پر تھا۔ مگر قاضی عہد الوردو نے ”دیدہ عیب ساز“ کی سند میں لفظی کا جو شرمشٹ کیا ہے اس سے یہ ترکیب درست ثابت ہوتی ہے۔ (نقد غالب ص ۳۰۲)
- ۱۰۔ غالب نے تخت تیز کی فصل نمبر ۱ میں لکھا ہے :

”یقین ہے کہ عربی و شغالی کھڈانے میں اسی قدر تقدیم و تاخیر ہیں جتنی برہان و غالب کے عہد میں تھی۔“

قاضی عہد الوردو نے غالب کے اس قول کو دلائل و شواہد سے غلط ثابت کیا ہے۔ (نقد غالب ص ۳۸۶)

- ۱۱۔ غالب نے تخت تیز کی دسویں فصل میں مولوی غیاث الدین رام پوری کے متعلق لکھا ہے کہ وہ ایک گم نام لٹ کتب دار تھے اور یکس رام پور واکار شہر ان سے نا آشنا تھے۔ مذکورہ انتخاب یادگار میں امیر مینائی نے مولوی غیاث الدین عورت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے غالب کا یہ بیان غلط ثابت ہوتا ہے۔ (نقد غالب ص ۵۳۳)

- ۱۲۔ تخت تیز کی آٹھویں فصل میں غالب نے مولوی احمد علی کے نقل کردہ اس مصرعے کو نامزد کیا قرار دیا ہے :

چشم مخالفین بیابان بہ شیر

مولوی احمد علی نے شمشیر تیز تر میں اس مصرعے کا وزن ”مفتعلن منہ طعن فاعلن“ بتایا ہے اور اس مصرعے کے مانند نواذر المصادر نیز مصرعے کی بحر کی بھی نشاندہی کی ہے۔ (بہ حوالہ غالب اور ان کے سرزمین ص ۲۳۸ تا ۲۳۹) تخت تیز میں فرض

کے اس مصرعے کو ناموزوں قرار دینا علم و دین میں غالب کی دستگاہ کے خلاف ایک مضبوط شہادت ہے۔

تیج تیز میں غالب کی متعدد اور بھی فروگزاشتیں موجود ہیں مگر اس مختصر مضمون کے محدود دائرہ میں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ آٹا احمد علی کی تالیف موتیہ برہان کے متعلق بلوکلان نے یہ رائے قائم کی ہے:

”احمد علی میں ناقذانہ چھان میں کا جو مادہ اور علمی صداقت شاعری ہے وہ ہند میں بطور شاذ ملتی ہے۔۔۔ غالب نے موتیہ برہان کا جواب دے کر غلطی کی ہے۔ انھوں نے اس میں غیر متعلق امور سے بحث کی ہے۔“

(قاری برہان و رسائل متعلقہ ص ۲۶۱)

موتیہ برہان از آٹا احمد علی کے متعلق قاضی مہد الودود نے لکھا ہے:

”.... موتیہ برہان کے مجھے کے متعلق غالب کی شکایات، بجا میں برہان کو غالب نے کچھ ہی کیوں نہ کہا ہو، غالب کے ہم عصروں کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ وہ ترکی بہ ترکی جواب دیں۔ موتیہ بہترین کتاب ہے جو قاری برہان کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اگر اس کا لہجہ مستدل ہوتا اور بجا بجا طولی بجاسے کام نہ لیا جاتا تو اور بہتر ہوتی۔ احمد نے تیج (تیز) کے جواب میں شمشیر تیز تر تحریر کی، مگر اس کا جھپا یا غالب کی وفات کے بعد تمام ہوا۔ اس کا لہجہ موتیہ سے بہتر ہے۔۔۔“ (کتاب برہان ص ۲۲ تا ۲۴ نقد غالب

ص ۲۸۰ تا ۲۸۱)

موتیہ برہان میں ۴۶۸ صفحات کی ضخیم کتاب کا شفی بخش جواب تیج تیز جیسے ۲۲ صفحات کے مختصر رسالے میں دینا ممکن نہ تھا۔ تیج تیز غالب نے ۲۲ برس کے سن میں اس وقت لکھی جب وہ بڑھاپے اور بیماری کے باعث پبلنگ پر ہی بیٹے رہتے تھے اور کسی محنت طلب عملی کام کے لائق نہ رہ گئے تھے۔ اس کے برخلاف مولوی احمد علی مؤلف ۱۲۵۵ھ نے موتیہ برہان (رسالی تالیف ۱۲۸۰ھ) ۵۱ برس کے سن میں اپنے شباب کی بھولہ رقت کے ساتھ لکھی تھی۔ موتیہ برہان

کی تیاری میں آغا احمد علی نے ایشیا تک سوسائٹی بنگال کے کتب خانے کی فرنگوں کو کھنگال ڈالا تھا۔ غالب بیداری کے عالم میں پلنگ پٹ ہوئے تھے اور تیغ تیز کے لیے ان کے پاس ضروری کتب میں بھی نہ تھیں۔ ان حالات میں موبد برہان جیسی باوزن کتاب کے مقابلے میں تیغ تیز کا ناکام رہنا فطری امر ہے۔

غالب اردو اور فارسی کے صف اول کے شاعر و نثر نگار تھے لیکن قاطع برہان اور اس کی تائید میں انہوں نے جو رسائی لکھے ان کا موضوع تحقیق ہے اور غالب تحقیق کے مرد میدان نہ تھے۔ تحقیق جس صحت و مست نیز جس وسیع و عمیق مطالعے کی طالب ہوتی ہے، غالب اس کے مادی نہ تھے۔ تحقیق کے لیے ایک میاری کتب خانے کی ضرورت ہوتی ہے اور غالب اپنے پاس کتابیں رکھنے کے شوق سے محروم تھے۔ (ذکر غالب ص ۲۰۷ تا ۲۰۸) قاطع برہان اور تیغ تیز میں غالب نے اپنے کو فارسی زبان کا بلند پایہ محقق ثابت کرنے کی جو کوشش کی ہے وہ ناکام رہی ہے۔

حواشی

۱۔ مشمولہ اردو سے نقلی (حصہ دوم) مطبع مجتہبان دہلی طبع اپریل ۱۸۹۹ء
ص ۳۲ تا ۳۳۔

۲۔ علی گڑھ میگزین غالب نمبر ۳۹-۱۹۳۸

۳۔ تیغ تیز مطبع اکمل المطابع دہلی طبع اول ص ۵۳۳۔

۴۔ (۱) علی گڑھ میگزین غالب نمبر ص ۱۳۳۔

(۲) مجموعہ نثر غالب اردو: مرتبہ خلیل الرحمن، نودی مجلس ترقی

ادب لاہور، ۱۹۶۷ء ص ۱۷۸۔

(۳) غالب بلیوگرانی: مرتبہ ڈاکٹر محمد انصار اللہ، علی گڑھ طبع ۱۹۷۲ء

حصہ اول ص ۳۸۔

۱) تنجہ تیز مشورہ قاطع برہان و رسائل متعلقہ : مرتبہ قاضی عبدالودود۔
 ۲) تنجہ تیز مشورہ مجموعہ شرف غالب اردو : مرتبہ خلیل الرحمن داؤد
 مجلس ترقی ادب لاہور طبع نومبر ۱۹۶۰ء۔

۳) قاطع برہان : غالب : مطبع منشی ذول کشور کھنڈو طبع اول، مطبوعہ ۱۳۷۸ھ
 ۴) مویہ برہان چار سو اڑھ صفحات پر ختم آغا احمد علی احمد کی ایک ضخیم فارسی
 کتاب تھی جو غالب کی قاطع برہان کی مخالفت اور برہان قاطع کے دفاع
 میں تھی اور طبع مظہر العباب کلکتہ سے ۱۳۸۲ھ میں شائع ہوئی تھی۔ (دیکھو :
 آثار غالب ۱ : مرتبہ : قاضی عبدالودود ص ۳۳۔ مشورہ علی گڑھ سیکرین
 غالب نمبر ۴۹ - ۶۱۹۳۸)

۵) لطافت لیبی : اکمل المطالع دہلی طبع اول (ص ۴۳) سے پتا چلتا ہے کہ
 یہ کتاب رجب الآخر ۱۲۸۱ھ میں چھپی تھی۔

۶) اردوے معلیٰ (حصہ اول) اکمل المطالع دہلی طبع اول، ص ۳۰۔

۷) اردوے معلیٰ (حصہ دوم) مطبع مہتابی دہلی، ص ۳۲ ۳۳ ۳۴۔

۸) تنجہ تیز طبع اول ص ۳۴۲۔

۹) ایضاً ص ۲۸ ۲۹۔

۱۰) ایضاً ص ۳۲۔

۱۱) تنجہ تیز مشورہ قاطع برہان و رسائل متعلقہ ص ۲۸۶ و بعد۔

۱۲) یہ مشنوی اب کلیات غالب (فارسی) جلد اول، مرتبہ سید رضی حسین خاں کھنڈو
 مجلس ترقی ادب لاہور طبع جون ۱۹۶۰ء میں غالب کے غیر متداول فارسی
 کلام کے طور پر شامل کی گئی ہے۔

۱۳) منقول از تنجہ تیز مشورہ قاطع برہان و رسائل متعلقہ ص ۲۶۵۔

۱۴) احوال غالب مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد ص ۱۳۔

۱۵) تفصیلات کے لیے دیکھیے : نقد غالب مرتبہ مختار الدین آزاد و مفتاح

قاضی عبدالودود۔

- (۲) آثار غالب : مرتبہ قاضی عبدالودود ص ۳۲ نیز ص ۳۵ تا ۳۴
 (۳) بین الاقوامی غالب میمنار : مرتبہ ڈاکٹر طلعت حسین خاں طبع ۱۹۹۹ء
 (۴) غالب اور ان کے معترضین : سید لطیف الرحمان طبع جنوری ۱۹۷۳ء
 ص ۲۳۸ تا ۲۳۹۔

- ۱۹ انتخاب یادگار : امیر مینائی، تاج الطالع (رام پور) ص ۲۶ تا ۲۷۔
 ۲۰ تفصیلات کے لیے دیکھیے غالب اور ان کے معترضین ص ۲۶ تا ۲۷۔
 ۲۱ ایضاً ص ۱۸۰ تا ۱۸۱۔

ضالع

اور تذکرہ آفتاب المصاب

ہندوستان میں فارسی زبان و ادب کی تاریخ بہت مفصل بھی ہے اور قریب بھی۔ اس اتحاد مندر کی جتنی غواشی کیجئے، اُتنے ہی گراں بہا موقیٰ ہاتھ لگتے ہیں۔ تذکرہ آفتاب عالم باب مولفہ قاضی محمد صادق اختر اسی بحر سیکرل کا ایک گراں قدر موقیٰ ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا اہل علم کو احساس تھا، لیکن اس کی تالیف کی وجہ سے اسے مفقود تصور کر لیا گیا تھا۔ خوش قسمتی سے راقم الحروف کو یہ تذکرہ مل گیا ہے، جو شمس آباد ضلع فرخ آباد ریوٹی کے ایک ذاتی کتب خانے میں محفوظ ہے۔

پیش نظر مضمون میں آفتاب المصاب کا مفصل تعارف مقصود نہیں، لیکن یہ تذکرہ چونکہ غالب کے عہد میں لکھا گیا ہے اور اس کا وقت اپنے دور کا ایک معروف معنی اور شاعر ہے؛ اس لیے اس تذکرے میں شامل غالب کے ترجمے کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی ترجمے کو پیش کرنا مقصود ہے، لیکن اس سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آفتاب المصاب کے مولف اور خود اس تذکرے کے بارے میں مختصراً کچھ عرض کر دیا جائے۔ قاضی محمد صادق اختر ہنگلی (ہنگال) کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۰۱ھ/۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محمد اسلم، ہنگلی میں قاضی تھے۔ ان کا سلسلہ نسب خواجہ عبداللہ احرار

سے ملتا ہے۔ ان کے آبا و اجداد ترکستان سے وہلی آئے اور یہاں سے پنگال منتقل ہوئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ان کا خاندان بیش تر عدلیہ سے وابستہ رہا اور غالباً اسی وجہ سے خود موافق کے نام کے ساتھ "قاضی" کے خطاب کا اضافہ نظر آتا ہے۔ مولف نے اپنی ایک تصنیف محمد حمید ریہ میں اپنے خاندانی بزرگوں کا ذکر کیا ہے۔

"برادر بزرگوار اس ذرۂ بے مقدار جناب مولانا شیخ احمد بن محمد بن علی بن اہلیم الانصاری البیہقی الشروانیؒ

اختر اپنے دور کے معروف عالم اور ادیب تھے اپنے معاصرین کی نظر میں ان کے علم و فضل کی بڑی وقعت تھی۔ بیش تر تذکرے اختر کی تصریحات میں ہم آواز ہیں۔ اختر کے ایک معاصر مہرتی عظیم آبادی نے، جو خود بھی ایک صاحب علم شخص تھے، مندرجہ ذیل الفاظ میں اختر کے علم و فضل، سخن دانی اور تصنیف و تالیف کو فراج حقین پیش کیا ہے :

"در قلم و سخن دانی علم سیف لسانی برافراختہ وصیت نظم طرازی و شعر نگاری خود را آویزہ گوش مالے سازفتہ"

آپ میاںؒ اور روز روشنؒ میں بھی اختر کی زندگی کے اس پہلو کو بہت سراہا گیا ہے۔ اختر ۱۲۳۶/۱۱۸۱ء میں لکھنؤ میں مقیم تھے۔ اسی سال محمد علی شاہ کے حکم پر اختر نے حدیقت الارشاد لکھی۔ اس کے بعد اختر نے مختلف حیثیتوں سے دیگر مقامات پر کچھ عرصہ گزارا اور ۱۲۳۵/۲۰-۱۸۱۹ء میں غازی الدین حیدر کی تحریک شیشی کی خبر سن کر وہ دوبارہ لکھنؤ پہنچے۔ غازی الدین حیدر اُن سے احترام کے ساتھ پیش آئے۔ نوابان لکھنؤ بھی اختر کی عزت نہیں کرتے تھے بلکہ انگریز افسر بھی ان کے قدموں پر تھے۔

یہاں اس امر کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ شیخ انجمؒ اور تذکرہ طور کاظمؒ میں یہ قریح ہے کہ اختر کو غازی الدین حیدر نے ملک اشرا کا خطاب دیا۔ شیخ انجمؒ میں یہ بھی مرقوم ہے کہ روز روشن کے مولف مظفر حسینؒ نے قاضی اختر سے ملاقات کی تھی، لیکن روز روشنؒ میں یہ اطلاع نہیں دی گئی کہ اختر کو غازی الدین حیدر نے ملک اشرا کا خطاب دیا تھا۔ اسی طرح کسی دوسرے معاصر ذریعے سے بھی اس کی تصدیق نہیں ہو سکی کہ اختر کو ملک اشرا کا

اقتدر مختلف مہدوں پر فائز رہے، لیکن ان کے فرائض منصبی ان کی ادنیٰ نور طبعی
کوششوں میں مانع نہیں ہوئے یہی وجہ ہے کہ اقتدر نے کافی تعداد میں کتابیں لکھی ہیں۔
یہاں ان سب کا ذکر ضروری نہیں سمجھتا، تاہم بتا دینا کافی ہے کہ اقتدر نے فارسی اور اردو دونوں
زبانوں میں طبع آزمائی کی۔ اردو میں ان کی کسی نثری تصنیف کا علم نہیں ہو سکا، البتہ
فارسی میں ان کی متعدد نثری تصنیفات آج بھی موجود ہیں۔

اقتدر اپنی زندگی کے آخری دور میں لکھنؤ منتقل ہو گئے تھے اور اسی شہر میں عتد
کے دوران ۱۲۴۳ھ، ۱۸۵۵ء میں فوت ہو گئے۔

تذکرہ آفتاب مالتاب، اقتدر کا ایک اہم تذکرہ ہے۔ اس میں شرایکے تراجم، ان کے
تخلص کی بنیاد پر حروف تہجی کے لحاظ سے ترتیب دیے گئے ہیں۔ چار ہزار دو سو چونتیس شعرا
کے حالات زندگی اور ان کے اشعار کا انتخاب اس میں شامل ہے۔ یہ تذکرہ سات سو پچتر صفحات
پر مشتمل ہے۔ بنیادی طور پر یہ فارسی شعرا کا تذکرہ ہے، لیکن اس دور کے بیشتر فارسی
شعرا چونکہ اردو کے شاعر بھی تھے، اس لیے یہ تذکرہ انیسویں صدی عیسوی کے اردو اور فارسی
شعرا کے حالات زندگی پر ایک بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

آفتاب مالتاب مندرجہ ذیل عبارت سے شروع ہوتا ہے:

ہذا خطہ تذکرہ فہم شاعرین اخذ از ذبیب سبیلہ حمد تجلی طرازی...

خود مواقع کے بقول اوائل عمری سے اس کی پہ آرزو تھی کہ وہ ایک تذکرہ
مرتب کرے، اسی وجہ سے وہ مختلف کتابوں اور منابع سے اقتباسات جمع کرتا رہا۔ تاہم
حالات نے ایک عرصے تک اسے اپنی ان ادبی کوششوں کو مرتب کرنے سے باز رکھا۔
بالآخر اس نے ۱۲۳۸ھ / ۱۸۲۲-۲۳ء میں یہ تذکرہ مرتب کرنا شروع کیا۔ اور تقریباً اکتیس
برس کی پیچم جدوجہد کے بعد یہ تذکرہ ۲۳ رمضان ۱۲۶۹ / ۱۸۵۳ء میں پایہ تکمیل
کو پہنچا۔

اقتدر نے اپنے ماخذ کی طویل فہرست دی ہے۔ اس فہرست میں فارسی کے پیش تر

اہم تذکرے اور تالیفیں شامل ہیں بعض بیاضیں بھی موقوف کے پیش نظر ہی ہیں۔

تذکرہ آفتابِ عالیشان قدیم و معاصر شعرا کا تذکرہ ہے۔ اس میں شامل پہلا شاعر آذربائیسی بہیقی اور آخری یوسف رضوی لکھنوی ہے۔ اس تذکرے کی یہ ایک اہم خصوصیت ہے کہ موقوف نے دوسرے تذکرہ نگاروں کی طرح شعرا کی زندگی اور آثار ہی سے متعلق الاما کا فراہم نہیں کیا ہے بلکہ ان کے کلام پر اپنی اپنی تلی رائے بھی ظاہر کی ہے۔ حالانکہ یہ رائے مختصر ہے، لیکن متعلقہ شاعر کے کلام کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً مہدی فتح پوری کے بارے میں اختر کا خیال ہے کہ :

”راحمِ حروف اگرچہ بدیدار شش بہر و مند نشدہ، انا از مضمونِ مکتوبے کہ
اشعارِ خود شش پیشِ نقیرِ اسال داشته بود، چنانا معلوم شد کہ نوشق
است۔“^{۱۹}

اسی طرح مبین لکھنوی کے متعلق اختر کی رائے ہے کہ :

”اگر چندے بسوی نظم متوجہ خواہ بود، در امثال و اقراں رتبہ پیدا خواہ
کرد۔“^{۲۰}

مہدی فتح پوری کے بارے میں اختر نے کچھ لکھا ہے، اس سے اس حقیقت کا علم بھی ہوتا ہے کہ اختر نے معاصر شعرا سے ان کے بارے میں مطلوبہ اطلاعات کی فراہمی کے سلسلے میں براہِ راست رابطہ بھی قائم کیا تھا۔

جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے اختر اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتے تھے، اس لیے دونوں زبانوں کی شاعری کے مزاج آشنا تھے۔ ان کے لیے نسبتاً آسان تھا کہ اپنے معاصر شعرا کے کلام کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کر سکیں۔ مصحفی کا ذکر کرتے ہوئے اختر نے اپنے ایسے ہی تقابلی مطالعے کی بنیاد پر لکھا ہے کہ فارسی شاعری اور ادب کے میدان میں مصحفی کا درجہ مرتزا اور تیسرے بلند ہے۔ اہل نظر اختر کی اس بے باک اور حقیقت پسندانہ رائے سے اتفاق کریں گے۔ اس ضمن میں اختر کے الفاظ مندرجہ ذیل ہیں :

”مصحفی لکھنوی : نام اوشیح غلام ہمدانی خلعت الصدق شیخ درویش محمد متوطن

شاہ جہاں آباد، محمد آصف الدولہ وزیر ہندوستان از دہلی بہ لکھنؤ آمدہ طرح اقامت
 نہاختہ۔ راقم الحروف در زبان پرختہ ہندی اور ایکے از شرای نمئے ہندوستان
 نی داند، آن بہار تست از میرزا و درد و تیر و سوز و مصمتی۔ لیکن مصمتی از تیر و تیرزا
 در فارسی نریدہ و قوت داشتہ^{۲۱}

قتیل (مستوفی: ۱۲۳۳ / ۱۸۰۷-۱۸۱۷) اختر کے استاد تھے، لیکن یہ نسبت
 شاگردی اختر کو قتیل کے مخالفین کے بارے میں سماندانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور نہیں
 کرتی۔ غالب کے متعلق اختر کی رائے اس حقیقت کی شاہد ہے۔

اختر اور ان کے تذکرے کے اس مختصر تعارف کے تعارف کے آغاز عالم تاب
 میں غالب کے ترجمے اور اشعار کو یہاں نقل کیا جائے گا لیکن اس سے قبل غالب اور
 مولف تذکرہ کے استاد قتیل کے باہمی تعلقات کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے۔ اس
 طرح آفتاب عالم تاب میں غالب کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، نہ صرف اس کی
 اہمیت کا اندازہ ہوگا، بلکہ مولف تذکرہ کے غیر جانب دارانہ رویے کی تصدیق بھی ہو جائے گی۔
 - تب نے خسرو کے سوا کسی ہندوستانی خداداد فارسی گو شاعر کو شاید ہی درخور اعتنا کہا
 ہو، اس ضمن میں قتیل بھی ان کے غیر ملامت کا نشانہ بنے۔

غالب ۱۲۴۰-۴۲ / ۱۸۲۷ء میں اپنی پیش کے سلسلے میں کلکتہ پہنچے۔ اس وقت
 غالب کی عمر تیس سال سے کچھ اوپر تھی۔ اس زمانے میں مدرسہ عالیہ کے زیر اہتمام ہر
 انگریزی ہونے کے پہلے اقوار کو ایک بزم سخن منعقد ہوا کرتی تھی۔ غالب اس میں شریک
 ہوئے اور ہمام تبریزی کی زمین میں ایک غزل پڑھی، جس میں یہ شعر بھی تھا:

جو ہے از عالم داند ہمہ عالم بیشم
 ہجو موئے کہ بتاں راز میاں بر خیسزد

اس شعر کے بعض الفاظ کے محل استعمال اور ترکیب پر معاصرین میں سے بس لوگو
 نے اعتراضات کیے اور کہا کہ پہلے مصرعے میں "بیش" کے بجائے "بیش تر" ہونا چاہیے۔
 کسی نے کہا کہ مصرع ثانی میں "موئے" زمیں کی ترکیب غلط ہے، نہ صرف یہ بلکہ یہاں

تک کہا گیا کہ پورا شعر بے سنی ہے۔ تیسرے شخص نے ہمدان کی ترکیب پر اعتراض کیا کہ ہمدان
مفرد ہے اور قیتل کے بقول اس کا ربط "ہمدان" کے ساتھ منوٹا ہے۔
اسی بزم میں غالب کی ایک دوسری غزل کے ایک شعر پر بھی اعتراض کیا گیا، شعر
یہ تھا:

شورِ اشک پہ فشارِ بختِ مژگناں دارم

لمعتِ برے سرو سامانی طوفاںِ زدہ

اس شعر میں "زدہ" کے استعمال کو غلط قرار دیا گیا۔^{۲۵}

غالب مستشرقین کی پہچانت برداشت نہیں کر سکے۔ وہ بہ قول خود "زبانِ دانی فارسی"
کو اپنی ازلی دستگاہ سمجھتے تھے اور "مبدیاً فیض" سے تلمذ کے قائل تھے۔ ان کا خیال تھا
کہ "فارسی کی میزان یعنی ترازو" ان کے ہاتھ میں ہے؛ اس وجہ سے یہ اعتراضات غالب
کی طبیعت پر گراں گزرے۔ اس کے علاوہ جب اعتراضات کے ضمن میں قیتل کا حوالہ دیا
گیا تو غالب نے ناک بھوس چڑھائی اور کہا: قیتل کون؟ وہی فرید آباد کا کستری بہت؟
میں کیوں اس فرومایہ کو سند ماننے لگا۔

غالب کے ان الفاظ پر ہنگامہ برپا ہو گیا۔ غالب کے دفاع میں محنت لوگوں نے
اعتراضات کا جواب دیا۔ لیکن یہ مخالفت اور تنازعہ ختم نہیں ہوا غالب کو اپنے مایوسوں کے
کہنے پر بدلہ مانخواستہ معذرت کے طور پر ایک مختصر مثنوی باوئی الفت لکھنی پڑی مصلحت
بھی یہی تھی، کیونکہ غالب کو ابھی کلکتے میں قیام کرنا تھا، اپنی پٹشن کے سلسلے میں، صاف
دور کرنا تھی اور اہل کلکتہ سے ان کو کام پڑ سکتا تھا۔

جس وقت اختر نے آنتاب مالتاب میں غالب کے حالات تحریر کیے، اُس وقت
اختر کے بقول غالب کی عمر ہجری کے حساب سے سینتالیس (۱۷۷۴) برس تھی۔ اس کا مطلب
ہوگا کہ اختر نے جس وقت غالب کے بارے میں اپنے تذکرے میں اظہارِ خیال کیا، اُس
وقت کلکتے کے ناگوار واقعے کو پیش آئے سو پندرہ برس بیت چکے تھے۔ بعید از قیاس
معلوم ہوتا ہے کہ اس اختلاف اور اس تنازعے میں غالب کے رویے سے اختر واقف نہ ہوں

اور انھیں اپنے استاد قتیل کے بارے میں غالب کے مخالفانہ اور جنگ آمیز رویے کی اطلاع نہ ہو، لیکن اس صورت حال کے باوجود اختر نے غالب کی نظم و نثر کی تعریف کی ہے، جو مولا علی کے ایماندارانہ تجزیے کی شاہد ہے۔ اور غالب کی شاعرانہ اور ادیبانہ خوبیوں کا ایک عام اعتراف بھی ہے۔

اس مزوری تفصیل کے بعد ذیل میں آفتاب عالم تاب میں غالب کا ترجمہ اور ان کے منتخب اشعار نقل کیے جلتے ہیں :

”غالب دہلوی :

نام نامیش اسد اللہ خاں مرحوم بہ میرزا فوشاہ ابن میرزا عبداللہ بیگ
 خاں مرحوم۔ وہ از گرامی خلفای دورمان استعداد است و ابھار افکارش ہر
 پری طلعتان حور خزاوہ از فروغِ نقش سوار دیدہ متور و از رواجِ نثرش
 دماغِ فطرتِ مسطر۔ بزرگانش ترک خزاوہ اند و نسب شریفش با فراسیاب
 و پشتگ می رسید۔ اہدلو و الان خراوش با سلمیو قیام چونند ہم گوہری داشتند و
 بعہد فرمانروائی آنہا علم سری و سروری می افراشتند۔ چون اکن بساط انہباط
 در نور دیدہ شد، ماکانش بسرقت نوران توطن اختیار کردند و جدا مجدش
 از پدر خود رنجیدہ عازم ہند گردید و بہ لاہور رسیدہ، چندے برفاقت خواب
 صنین الملک بسرزد۔ چون خواب قدر دال، داعی حق را لبیک اجابت گفت،
 بہ دہلی آمد۔ بصحبت ذوالفقار الدولہ میرزا جمعت خاں پیوست و عبداللہ بیگ
 خاں در دہلی از کسم عدم بوجہ آمد و اس میرزا غالب در کبر آباد از شب تا بستی
 بجلوہ گاہ ہستی غرامیدہ۔ چون عم بزرگوارش نصر اللہ بیگ خاں با پارہ سوار
 جزار بمعیت مصاص الدولہ جنرل لارڈ لنک پہ سالار انگریزی با مرکشان بہرت پور
 و خیر و مرگرم کارزار بود، در مجلہ دی آں دو پرگتہ سیر حاصل بجای خود یافتہ بالقوانی و
 لواحق مرگ ادقات بفرغبال می نمود۔ سپس بموضع جاگیر مشاہرہ از سرکار اٹک پہ
 قرار یافت۔ تا سرور و بہ معاش میرزا غالب و دیگر باقی ماندگان آں منغور۔ ماں مشاہرہ

است نین عمر گرامیش تا تو بر این سطر پہل و ہفت ہجری رسیدہ باشد و اہمب
 بی منت اودا عمر دراز ترے کرست فرمودہ وراثت و جاود خیالی نیز نگ نگار و چہرہ
 کشائی پر کی طلعتان اسرار دارد و ایہ اشعار از افکار باقی نظر شد آئین اوست :

کشت رنگ تار سوانا از بقیار اس را

بگر خوشست از بچم نکاہست از نواں را

کفت خاکیم از ما بر خیزد جز غبار : غبار

فزون از مرصے نمود قیاس اس را

بر نیم غالب از ذوق سخن فحش بوساں بود

ملحمتے تکب و پارہ انصاف یار اس را

بیا کہ قاعدہ آسمان بگردانیم قضا بگردش رطل گراں بگردانیم
 گل انگینم و گلابی برگزیر پاشیم سے آوریم و قدح درمیاں بگردانیم

چکویم از دل و جانے کہ در بباطنت ستم رسیدہ یکے نا امید داریکے

زلزلت می تپد غضب رنگ لعل گہر پاشش شبید انظار بخود خویش است گفتار مش

دوست دارم گر ہے را کہ بکارم زده اند کایں ہماست کہ پیوستہ در اہوی تو بود

نومیدی ما گردش ایام ندارد روزے کہ چہ شد سحر و شام ندارد

غیرم کہ با فشاندن الماس نیز زم مشتے نمک سودہ بزخم جگر م ریز

بر امید بشیوہ صبر آزمایی زایسم تو بریدی از من و من استخوان نامیدمش

ملاق شد ملاقت ز عشقت بر کراں خواهم شد
مهر باں شود در زرخود مهر باں خواهم شد

لذت مشرق ز فیض بنیوانی حاصلست
آنچه باں تنگست دست من که چندی داشت

ز سرودی نفس نامر بر تو اں دانست
که نارسیده پیام مرا جوابی هست

مومے که برون نالده باشد چه نماید
بیهوده در اندام تو جستم میاں را

کن زبوا چندین کوی بتان بجایم
دماغ نازک من بر نمی تابد تقاضا را

بیم انگند می را چاره رنج خار ما
قدح بر خولش میلند ز دست بهوش دار ما
خوشا جانے که اندھے فرو گیرد سراپایش
ز نویدی تو اں پرسید لطف انتظار ما

حیرت زده جلوه نیرنگب خیالیم
آئینه دارید بر پیش نفس ما

نظاره خط پشت لبش ز خویشم برد
ز باوه نشه فزونی دانه اندنگش را
جگر نشه نهیم بر خود اعتماد نیست
مباد دل به پیش رو کند خدنگش را

نازم فردغ باوه ز عکس جمال دوست
گوی فشرده اند بهجام آفتاب را

مختلف بر طوط لب تشنه بوی کند ستم
ز داهم باز چیں دام نوازشهای پنهان را

بسکه غم تو بوده است تعبیه در مرثشت ما
نسخه فتنه می برد چرخ ز سر نوشت ما

باده اگر بود حرام پذیر غلام شرع نیست دل نهی بخوب با المعز من برفت ما

ای لذت جنای تو در خاک بعد برگ با جاں مرشد مسرت عمر دوباره را
شمع از فروغ چیره ساقی در انجمن چون گل بسزد است ز سستی نظار را

دود آه از جگر چاک دمیدن دارد زلف نیز است ز به دستگم شاد ما
خوش فرو میرود انبوی رقیبت در دل پند گوش تو گردد مگر افسانه ما

گر بینی ترسی جلوه صورت چه کم است خم زلف و شکن طرف کلاه در یاب
داغ ناکامی مسرت بود آئینه وصل شب روشن طلبی در دوزیا به در یاب
غالب و کش مکش بیم و امیدش بهیات یار تیغ بکشد دیا بر نگاه به در یاب

جنون ممل بصیرای تحیر رانده است اشب
نگه در چشم و آهیم در جگر و مانده است اشب
بدوق و عده سامان نشاط کرده پندارم
ز فرش گل بروی آتشم بنشانده است اشب
بخواهم می رسد بند قبا واکرده از سستی
ندانم شوق من بروی چاقسون خوانده است اشب
خوش است افسانه در وجدانی مختصر غالب
بحشری تو اس گفت آنچه در دل مانده است اشب

عزیزت کمی میرم و مردن نتوانم در کشور بیداد تو فرمان قضا نیست
بخت نکند چاره اسرگی دل تعمیر اندازه دیرانی مانع نیست

بشپ حکایت قلم زغیر می شنود هنوز قلم بذوق فسانه بیدار است
فناست بستی من در تصور کمرش چونکه که هنوزش وجود در تار است

هزده موج جلوه حسن یکانه ایست گوئی طلسم شش جهت آینه خانه ایست
خود داریم بفضل بهار ان معانی میفت گلگون شوق را رنگ گل تا زینا ایست

یار در عهد شبام بکنار آمد و رفت همچو عید که در ایام بهار آمد و رفت
بغریب اثر جلوه قاعل مسد بار جان سپرداکی شمع مزار آمد و رفت
شادی دغم همه بگشته ترا زیکه کردند روز روشن بود رخ شب تار آمد و رفت

آمد و از تنگی جابه جابه پرچین کرد و رفت بر خود از ذوق قدم دوست بالید نهاد

مالذت دیدار ز پیغام مگر تقسیم مشتاق تو دیدن ز شنیدن نشاسد

ز بس کز لاله گل حسرت ناز تو می شود خیابان محشر و لهای خون گردید را ماند
رقیبش برده از راه و وفا جنگ که در چشم غبار راه او مشرک را برگردیده را ماند

گفت باشی که بهر حیل در آتش گلشن غیر میخواست مرا بے تو بگزار برود
تو نیایی باب بام میبوسی تو مدام دیده ذوق نگه از دین دلجو برود

چه خیزد از سنخ کز در دین جان نبود بریده باد زبانه که خون چکان نبود
حکیم ساقی دے تند و من زبده غوثی ز رطل باد به چشم آیم اگر گراں نبود

ایں زلفاں زیادہ جو پرہیز گفت آئند آرتے دروغ مصلحت آہیز گفت آند

درہدیہ دل دوری بعد اہم پریرد منت نہ سراپا بری را چہ کند کس

جنوں ستم بفضل فوہیام بتوں کشتن صراحی برکت دگل درکندام بتوں کشتن

دولت اہل طہ نبود، اگر کردہ پیشاں شو کافر بتوں شد، تا چار مسلمان شو

سبب اعیام

آنمرد کہ زن گرفت، دانا نبود از غصہ فراتش ہسانا نبود

دارد بچہاں خانہ دزن نیست درد تازم، بخت اچرا توانا نبود

سائل ز گدا بجز ملامت نہرد مرگ از عاشق بجز مذمت نہرد

از سید من کہ قلام خون دلست جز تیر تو کس جاں بسلاست نہرد

غالب بسمن گر چہ کست، ہسرن نیست در نشہ ہوش ہیبت اندر ہسرن نیست

مے خواہی دمفت و نفزوانگہ بسیار ایں بادہ فروش ساقی کوثر نیست

فرصت اگر دست دہ منتہم انگار ساقی دشرابہ و منفی و سہرہ دے

ز نہار ازاں قوم نباشی کہ فریبند حق را بہودے و نی را بہرودے

آخری دو شعر مالا لکھ اختر نے رباعیات کے تحت درج کیے ہیں، لیکن ظاہر ہے یہ رباعی نہیں، یہ دو شعر کا ایک قطعہ ہے اور غالب کے مطلوبہ کلیات میں موجود ہے، البتہ پہلے

شعر کے دوسرے مصرعے کے الفاظ کی ترتیب میں معمولی اختلاف ہے۔

حواشی

- ۱۔ اختر نے اپنی غزل کے ایک شعر میں خود کو طوطی بنگالہ کہا ہے :
در غزل خوانی بایں خوش، ہجلی بلبل کجاست
نلدہ اختر زبانِ طوطی بنگالہ است
- ۲۔ رک : دیوانِ اختر، ایشیاٹک سوسائٹی، شمار ۳۱۰، ورق ۱۹۔ الف
خوش معرکہ زریا، تفتیش از عطا کا کوئی، ص ۱۰۱۔ اس کے علاوہ خود لفظ اختر
سے بھی یہی سال برآمد ہوتا ہے۔
- ۳۔ کلینڈر آف برٹش کورس پونڈنس، خدا بخش لائبریری، ج ۵، ص ۳۳۸؛
برقم غن، مفید نام پریس، ص ۱۱-۱۲، اپرنگر اپنی فہرست (ص ۱۶۶) میں
ریاض الوفاق کے حوالے سے خود اختر کا نام محمد علی بتاتا ہے۔ لیکن ریاض الوفاق
میں یہ اشتباہ موجود نہیں۔
- ۴۔ خوش معرکہ زریا، تفتیش، ص ۱۰۱
- ۵۔ محمد حیدر، مطلع شامی، ص ۱۳۶
- ۶۔ ریاض الافکار، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ۔ شمارہ ۲۸، ص ۹
- ۷۔ آب حیات ناشر شیخ مبارک علی، لاہور، ص ۳۳۶۔
- ۸۔ روز روشن، مطلع شاہجہانی، ص ۳۷-۳۸
- ۹۔ حدیقۃ الارشاد، مولانا آزاد لائبریری، ذخیرہ اسلام، شمارہ ۳۵/۱۰۸۱
- ۱۰۔ محمد تیدریہ، ص ۱۳
- ۱۱۔ روز روشن، ص ۳۷
- ۱۲۔ شمع انجمن، مطبوعہ سہو پال، ص ۶۳

۱۳. طورِ حکیم، مفید عام پریس آگرہ، ص ۱۰
۱۴. اختر نے کانپور میں ۱۹ برس تحصیلداری کے فرائض انجام دیے۔ اسپرنگ نے فہرت (ص ۱۶۶) میں بھی لکھا ہے کہ ۱۸۵۳ء میں اختر کانپور میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ اختر نے علی گڑھ میں سرمنری ایلیٹ سے ملاقات کی اور ان کے کہنے پر ۱۳۳۳ھ/۱۸۴۴ء میں اپنی کتاب تقریر الجوہر لکھی۔ رک : اسٹوری، ج ۱، حصہ اول، ص ۱۵۱، نوش معرکہ زیب، تلمیض، ص ۱۰۱۔
۱۵. اردو میں اختر کی ایک عشقیہ مثنوی سراپا سوز سلطج سبھی کھنٹے شائع ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ ولی اللہ نے اپنی تاریخ فرخ آباد میں اختر کے چند اردو اشعار نقل کیے ہیں۔ تاریخ فرخ آباد مولانا آزاد لائبریری شملہ ۱/۹۵۳، ورق ۱۵۵، لٹ۔ روز روشن، ص ۳۸
۱۶. آفتاب عالم تاب، ص ۲۰ چند کربے کی تاریخ آغاز کا مادہ تاریخ "سایت البقا" تحریر ہے۔ اس سے یہی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔
۱۷. آفتاب عالم تاب، ص ۵
۱۸. ایضاً، ص ۶۶۳
۱۹. ایضاً، ص ۲۲۰
۲۰. آفتاب عالم تاب، ص ۵۲۳
۲۱. اختر نے اپنے مندرجہ ذیل اشعار میں قنیل کو اپنا استاد کہا ہے :
- ز فیض تربیت حضرت قنیل اختر
برزگ و سمن شد مرا زبان نمبر
- فردہ از غور شیدایم بنساید کسب نذر
از قنیل اختر طریق نکتہ دانی یاد گیر
- (دیوان اختر، ورق ۶، لٹ۔ ۳۶، لٹ۔ ۱۱۶)
- اس کے علاوہ رک : ریاض الافکار، ص ۹-۱۰، بزم سن، ص ۱۳
۲۲. غالب کی تاریخ ولادت ۸ رجب ۱۲۱۱ھ/۸ اوتار ۱۸۹۶ء ہے رک : عیار غالب

مرتبہ مالک رام، ہلی مجلس میں سید محمد حسین رضوی کا مضمون "غالب کی صحیح تاریخ و تذکرہ" ص ۱۲۵۔

۳۳۔ اس تنازعہ کی تفصیل کے لیے رک : ذکر غالب، مالک رام، پانچواں ایڈیشن ص ۹۰، ۹۱۔
غالب کے ایک قصیدے "در خجبت سید الشہداء علیہ السلام" کے ایک شعر میں بھی
اس ہنگامے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

نفس بلرزہ ز ہا و نہیب کلکتہ

نگاہ خیرہ ز ہنگامے ار آباد

۳۵۔ اس بزم سخن کی اطلاع غالب نے اپنے خطوط بنام عبد الغفور مسرور اور عبد الرزاق شاکر
یہ بھی دی ہے۔ رک : کلیات، نثر غالب۔

۳۶۔ اس مثنوی کا اصلی نام "آشتی نامہ" تھا۔ اور اس کی وہ روایت جو کلکتہ میں پیش کی
گئی تھی، کلیات کی روایت سے مختلف ہے۔ پہلی روایت میں بھی ایسے اشعار موجود تھے
جو اس شخص کی زبان سے جو غلط فہم کی دلچسپی چاہتا ہو، مناسب نہ تھے۔ لیکن روایت
آخر میں تو مخالفت اور نمایاں ہو گئی۔ مقالہ اقتسامیر، قاضی عبدالودود، بین الاقوامی
غالب سمینار، مرتبہ ڈاکٹر لوسٹ مبین خان، ص ۴۴ اس مثنوی کی سب سے ابتدائی
شکل نامہ پای فارسی غالب مرتبہ قرظی میں شامل ہے۔

۳۷۔ غالب کا یہ ترجمہ آفتاب مانتاب میں ص ۲۶۷ پر ملتا ہے۔

۳۸۔ آفتاب مانتاب میں غالب کے جو اشعار نقل ہوئے ہیں، انہیں دیوان فارسی غالب
مرتبہ ضیاء الدین نیر طبع دار السلام، دہلی، سے تقابلی کے بعد نقل کیا گیا ہے۔ اختلاف
نسخ کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔

۳۹۔ آفتاب مانتاب: نیم

۴۰۔ دیوان غالب فارسی: پیام، ص ۳۱۲

۴۱۔ دیوان فارسی غالب: باید زے ہر آئینہ پر سبز گفتہ اند، ص ۲۵۲

۴۲۔ ایضاً، آرام، ص ۲۹۰

۳۳. دیوانہ فادر کی غالب : سہی ص ۳۸۰

۳۴. ایضاً : اتر، ص ۳۹۷

۳۵. ایضاً : ساقی دمعنی و شرابی و سرودے، ص ۳۹

غالب اکیڈمی کراچی